جلد ۱۵ — جنوری ۱۹۶۸ء — شمارہ ۱

ماہنامہ

میثاق

لاہور

★

زیر سرپرستی

مولانا امین احسن اصلاحی

★

مدیر مسئول

اسرار احمد

★

یکے از مطبوعات

دارالاشاعتِ الاسلامیہ

امرت روڈ، کرشن نگر، لاہور - ۱

فون نمبر ۶۵۵۲۲

قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے

Regd. No. L. 7360.

Monthly "MEESAAQ" Lahore

Vol. 15	JANUARY 1968	No. 1

علوم قرآنی کا بیش بہا خزانہ

مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر

تدبرِ قرآن

جلد اول — مشتمل بر

مقدمہ وتفاسیرآیۂ بسم اللہ، سورۂ فاتحہ، سورۂ بقرہ و سورۂ آل عمران

سائز ۲۲×۲۹، صفحات ۸۸۰

آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت

چرمی پشتہ کی مضبوط و پائدار جلد کے ساتھ

ہدیہ ۳۰ روپے

(محصولڈاک: ایک روپیہ پچھتر پیسے)

(اکتیس روپے پچھتر پیسے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں یا وی پی طلب کریں)

اس کے علاوہ تفسیر آیت بسم اللہ و سورۂ فاتحہ

علاحدہ مطبوعہ بھی موجود ہے نمونہ کے طور پر طلب کرنے کے لئے صرف پچاس پیسے کے ٹکٹ ارسال فرمائیں

بڑا سائز - صفحات ۳۶ - ہدیہ ۷۵ پیسے

دارالاشاعت الاسلامیہ

امرت روڈ - کرشن نگر - لاہور نمبر ۱ — فون نمبر ۶۵۵۲۲

نقوش پریس اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ اُمّتِ مسلمہ کی غرضِ تاسیس اور اس کا مقصدِ وجود ہی ’دعوت الی اللہ‘ ہے اور دنیا میں اس کی عزت و سربلندی ہی نہیں بلکہ اس کے وجود و بقا کا تمام تر انحصار بھی اس پر ہے کہ وہ اپنے اس فرضِ منصبی کو کماحقہٗ ادا کرے ——— ۲۔ پھر دعوت الی اللہ ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم و فداہ ابی و امی کی وہ سب سے زیادہ مؤکد سنت ہے جس پر آپؐ کا تواترِ عمل ظاہر و باہر ہے۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا اوّلین تقاضا بھی یہی ہے کہ آپ کی سنّتِ دعوت کا اتباع کیا جائے!

۳۔ مختلف مذہبی جماعتوں اور فرقوں نے اپنے اپنے مسلک و مشرب کی اشاعت و توسیع کے لئے ’مبلغین‘ کی جو سول سروس جاری کی ہوتی ہے، وہ ’دعوت الی اللہ‘ کے نقطۂ نظر سے نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہے بلکہ الٹی مضر ہے! ——— ۴۔ دعوت الی اللہ کے اصل لوازم ایمان اور عمل صالح ہیں نہ کہ فروعاتِ دین کا علم۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر یقینِ واثق اور اعمالِ صالحہ و اخلاقِ حسنہ کے امتزاجِ جمیل کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ داعی میں تواضع و انکسار پایا جائے اور اس کی دعوت بھی محض اللہ اور اس کے دین کی طرف ہو تاکہ نہ اس کی اپنی شخصیت ایک نیا بُت بن سکے اور نہ ہی اس کے حلقہ بگوش ایک نئے فرقے کی صورت اختیار کر سکیں۔

۵۔ دعوت الی اللہ کے بہت سے پہلو اور بے شمار مدارج و مراتب ہیں، اور آج کی گفتگو کا اصل موضوع ’دعوت الی اللہ‘ کی وہ ابتدائی اور بنیادی منزلیں ہیں جن تک ہر باشعور مسلمان کی رسائی ممکن بھی ہے اور لازم بھی!

اب میں آپ کی توجہ سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ان واقعات کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں جو بعثت کے فوراً بعد پیش آئے۔ تاکہ ایک طرف ’دعوت الی اللہ‘ کے اصل مبادی و اصول اور اس کا صحیح نہج و اسلوب واضح ہو جائے اور دوسری طرف یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت کے ابتدائی دور میں وہ تمام مشکلات پیش آئیں اور ان تمام دل شکنیوں کا سامنا کرنا پڑا جو کسی بھی دعوت کے ابتدائی ایام میں پیش آنی لازمی ہیں اور آپ نے بعینہٖ انہی فطری طریقوں کو اختیار فرمایا جو کسی بھی

شخص کو کسی دعوت کے پیش کرنے کے لئے لازماً اختیار کرنے پڑتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کی زندگی بھی اخلاقِ حسنہ کا ایک کامل نمونہ تھی اور آپؐ کی سیرت و اخلاق پر کسی قسم کا کوئی داغ یا دھبہ موجود نہ تھا۔ آپؐ نے اپنے حسنِ اخلاق اور صلاحِ معاملگی کی بدولت اپنے معاشرے سے ’الصادق‘ اور ’الامین‘ کے خطابات حاصل کئے تھے۔ یہ واضح رہنا چاہئے کہ آپؐ نے یہ خطابات زندگی کی عین منجدھار میں رہتے ہوئے حاصل فرمائے تھے نہ کہ اس سے دور کسی گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر۔ آپ ہمیشہ اپنی سوسائٹی میں ایک فعّال فرد کی حیثیت سے شریک رہے، حتیٰ کہ آپؐ نے اس وقت کی اعلیٰ ترین سطح پر کاروبار بھی فرمایا اور حقیقت یہ ہے کہ در اصل اسی میدان میں آپؐ کی صداقت اور امانت کے اصل جوہر نمایاں ہوئے ——— بعد میں جب آپؐ ’دعوت الی اللہ‘ کے منصب پر فائز ہوئے تو اس وقت آپؐ کی دعوت کی تاثیر میں جہاں اس بات کو دخل ہے کہ خود وہ دعوت فطرتِ انسانی کے نہایت قریب اور عقلِ صحیح و طبعِ سلیم کی جانی پہچانی تھی، وہاں اس امر کو بھی فیصلہ کن حد تک دخل حاصل ہے کہ اس کا پیش کرنے والا ’الصادق‘ اور ’الامین‘ تھا۔

قربِ بعثت کے زمانے میں آپ پر تفکر کا غلبہ ہو گیا، اور رفتہ رفتہ ’حاضر و موجود‘ سے بیزاری اور حقیقتِ نفس الامری کی تلاش و جستجو کا جذبہ بڑھتا چلا گیا، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ثم حبب الیہ الخلاء فکان یخلو بغار حراء فیتحنث فیہ۔ پھر آپؐ کو خلوت گزینی محبوب ہو گئی چنانچہ آپؐ غارِ حرا میں خلوت گزیں ہوتے تھے اور وہاں عبادت فرماتے تھے۔ شروحِ حدیث میں اس عبادت کی نوعیت ’التفکر والاعتبار‘ یعنی غور و فکر اور عبرت پذیری بیان ہوئی ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ سلسلہ کتنے عرصے چلا۔ بہرحال وہ وقت آگیا کہ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں کو ہدایتِ تامہ حاصل ہوئی۔[1] وحی کا سلسلہ شروع ہوا، حقیقت پر سے پردے اٹھا دیئے گئے، آپ کو منصبِ نبوت عطا ہوا اور آپ ’دعوت الی اللہ‘ کے علمبردار اور قرآن مجید کے الفاظ میں ’شَاہِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا‘ بنا دیئے گئے۔ — فصلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔

بعثت کے فوراً بعد دعوت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چنانچہ فطری طور پر سب سے پہلے ان قریب ترین لوگوں کو دعوت دی گئی جن کے ساتھ آپ کا اٹھنا بیٹھنا رہا تھا اور جو آپ کے اخلاق و عادات سے سب سے زیادہ واقف تھے یعنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ، چچا زاد بھائی جنہوں نے آپ ہی کے سایۂ عاطفت میں تربیت پائی تھی یعنی حضرت علیؓ، آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ اور جگری دوست حضرت صدیق اکبرؓ ——— چنانچہ یہ سب حضرات

---

[1] وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی (سورۃ والضحیٰ) ترجمہ: پایا تمہیں تلاشِ حق میں سرگرداں، تو ہدایت دی!

پہلے ہی دن ایمان لے آئے ۔۔۔ اور یہیں سے دعوت الی اللہ کا پہلا سبق واضح ہوا یعنی یہ کہ یہ گھر سے شروع ہوتی ہے اور اس کا اوّلین میدان انسان کے قریب ترین اعزہ و اقارب ہی یا عزیز ترین اصدقاء و احباب !

پھر ان سابقون السابقین نے "اتباع سنت" کا جو مفہوم سمجھا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ دعوت کا جس طور سے اتباع کیا اس کی سب سے درخشاں مثال حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے قائم فرمائی کہ داعیِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں خود بھی فوری طور پر داعی بن گئے اور یہ ان ہی کی دعوت و تبلیغ کا اثر تھا کہ سابقون الاولون کے سرگروہ اور گلِ سر سبد عثمان غنیؓ، عبدالرحمانؓ ابن عوف، طلحہؓ، زبیرؓ، سعدؓ بن ابی وقاص، ابو عبیدہؓ ابن الجراح، عثمان بن مظعون وغیرہم اللہ کے دین میں داخل اور امتِ محمدیہ میں شامل ہوئے۔ فجزاہ اللہ عن جمیع المسلمین والمسلمات خیر الجزاء۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ محبتِ رسولؐ کا اصل تقاضہ آپؐ کی سنتِ دعوت کا اتباع ہے۔ واضح رہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کوئی زاویہ نشین یا گوشہ گیر انسان نہ تھے۔ بلکہ معاشرے کے ایک متمول اور با اثر شخص اور ایک نہایت کامیاب تاجر تھے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے ہر شخص کے احسانات کا حساب چکا دیا۔ سوائے ابو بکرؓ کے ان کے احسانات کا بدلہ میں نہیں دے سکتا۔ اللہ ہی دے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابو بکر نے اپنی بالکل ابتدائی دور کی دعوت و تبلیغ سے امتِ محمدیہ کو ان مایہ ناز ہستیوں کا تحفہ دے کر جو احسان عظیم کیا ہے پوری امت اس کا بدلہ چکانے سے تا قیامت معذور رہے گی! ۔۔۔ یہ دعوت الی اللہ کے شجرۂ طیبہ کی ایک شاخ کا ذکر تھا جو تمام شاخوں میں سب سے بڑھی تھی۔ لیکن تنہا نہ تھی، حقیقت یہ ہے جو شخص بھی اس دعوت پر ایمان لایا وہ فوری طور پر خود بھی اس کا داعی بن گیا۔

"اصلِ ثابت" کی طرف رجوع کیجیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ملا۔ "وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ" اپنے قریبی عزیزوں کو خبردار کرو۔ سوچیے! آج بھی کسی کو حکم ہو کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو کوئی پیغام پہنچا دو تو وہ اس کے لئے سب سے اچھا طریقہ کونسا اختیار کرے گا؟ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پورے گھرانے یعنی بنو ہاشم کی دعوت کا اہتمام فرمایا۔ چالیس کے لگ بھگ آدمیوں کو کھانا کھلانے کے بعد ان کے سامنے اپنی دعوت ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کرنی چاہی، لیکن ابولہب کی بکواس نے اس کا موقع ہی نہ دیا اور مجلس ویسے ہی برخاست ہو گئی۔ سوچیے کتنی دل شکنی اور کیسی مایوسی کا سامنا حضور کو ہوا ہو گا! ۔۔۔ لیکن داعی الی اللہؐ کیلئے مایوسی کا کیا سوال، پھر اہتمام فرمایا۔ دوبارہ کھانا کھلایا اور پھر دعوت پیش فرمائی ۔۔۔ روایت ہے کہ بھرے مجمعے میں سے صرف ایک نوجوان، جسے نوجوان کے بجائے بھی بچہ ہی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ ایسا نکلا جس نے ساتھ دینے کا وعدہ کیا ۔۔۔ چشمِ تصور سے دیکھیے کہ اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاندان کو اللہ کی طرف بلاتا ہے۔ لیکن کوئی ایک شخص بھی ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ حضرت علیؓ تو پہلے ہی سے اپنے تھے ان دونوں دعوتوں کا ماحصل تو

صفر ہی رہا ۔۔۔ ایسے ہی تو مواقع تھے جن پر وحی الٰہی تسلی و تشفی کے تئے اترتی تھی کہ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا[1] اور وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ[2]۔

حکم ہوا۔ "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" ۔۔۔ جس بات کا تجھے حکم ملا ہے اسے برملا اور علی الاعلان کہہ! آپ نے وقت کے رواج اور دستور کے مطابق کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر نعرہ لگایا "واصباحاہ" "لوگو! خطرہ درپیش ہے۔ فوراً جمع ہو جاؤ" جب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے پہاڑی کا وعظ ارشاد فرمایا ۔۔۔ ارشاد ہوا "اے معشر قریش اگر میں تم سے کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آ رہا ہے تو تم کو یقین آئے گا؟" سب نے کہا کیوں نہیں؟ جبکہ ہم نے آپ کو ہمیشہ سچ بولتے ہی دیکھا ہے! تب آپ نے فرمایا "تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر دردناک عذاب نازل ہو گا!" ۔۔۔ لوگ سخت برہم ہوئے اور کہتے ہیں کہ اسی موقع ابو لہب نے کہا تھا "تَبًّا لَكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا" تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں کیا بس اسی لئے تو نے ہمیں جمع کیا تھا جس پر سورہ لہب نازل ہوئی کہ ہاتھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نہیں بلکہ ابولہب کے ٹوٹ چکے! ۔۔۔ لیکن ابولہب کے ہاتھوں کا ٹوٹنا تو ابھی عالم امر میں تھا۔ عالم واقعہ میں تو اس کا ظہور بہت بعد میں ہوا۔ اس وقت جو صورت بالفعل موجود تھی وہ تو یہی تھی کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم گویا اندھوں اور بہروں کے سامنے اپنی دعوت پیش فرما رہے تھے جس کا قبول کرنے والا کوئی نہ تھا۔ پہاڑی کے اس وعظ کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اصل دلیل داعی کی صداقت و امانت کا وہ عام اقرار ہے جو سوسائٹی میں موجود تھا اور مقام نبوت کی وضاحت کے تئے موقع اور محل کے اعتبار سے بہترین تمثیل پیش کی گئی ہے کہ جیسے بلندی پر کھڑا ایک شخص دونوں طرف دیکھ رہا ہوتا ہے جبکہ پستی میں کھڑے لوگ دوسری طرف کے حالات سے واقف نہیں ہو سکتے اسی طرح نبی کی نگاہ میں دنیا و آخرت دونوں ہوتے ہیں جبکہ عام انسانوں کی نگاہ میں دنیا کے بھی صرف ظاہر تک محدود ہوتی ہے۔ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ[3]۔

اس طرح رفتہ رفتہ دعوت کا حلقہ وسیع ہوا۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ایسے کتنے اجتماعات کو آپ نے خطاب فرمایا، کتنے لوگوں سے ان کے گھروں پر جا کر ملاقات کی اور ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کی، دھن کا عالم یہ تھا کہ جب بھی معلوم ہوا کہ کوئی قافلہ باہر سے آیا ہوا ہے یا کوئی نو وارد مکے میں موجود ہے آپ اس کے پاس پہنچ جاتے اور اپنی دعوت پیش فرماتے ۔۔۔ اسی سے دعوت اور تعلیم و تدریس کا فرق واضح ہوتا ہے معلم و

[1] اپنے پروردگار کے فیصلے کا انتظار کر، تو ہماری نگاہوں ہی میں ہے! [2] بس صبر کر اور تیرا صبر اللہ ہی کے بھروسے پہ ہے۔ [3] سورہ روم۔ یہ لوگ واقف ہیں حیات دنیوی کے بھی بس ظاہر ہی سے اور آخرت سے تو پورے غافل ہیں۔

مدرس یوں در در کی ٹھوکریں نہیں کھاتے بلکہ وہ مطلوب و مرجع ہوتے ہیں اور طالبانِ علم ان کے پاس آتے اور ان کی ناز برداریاں کرتے ہیں جبکہ داعی طالب ہوتا ہے اور لوگ مطلوب، وہ گھر گھر جاتا ہے ہر دروازے پر دستک دیتا ہے، ہر گوش تک اپنی آواز پہنچاتا ہے، لوگ تمسخر کرتے ہیں، تعذیب سے بھی نہیں چوکتے، جھٹلاتے اور دھتکارتے ہیں تو داعی الی اللہ رات کے وقت اپنے رب کے حضور میں عاجزی و فروتنی کے ساتھ گڑگڑا گڑگڑا کر ان کی ہدایت کے لیے دعائیں کرتا ہے اور ایک ایک کا نام لے کر درخواست کرتا ہے کہ باری تعالیٰ! عمر ابن الخطاب یا عمرو بن ہشام میں سے کوئی ایک تو مجھے ضرور ہی عطا فرما دے" — ایک طرف یہ اور دوسری طرف یہ بھی نگاہ میں رہے کہ داعی الی اللہ کے سینے میں پتھر کا ٹکڑا نہیں بلکہ ایک انتہائی حساس قلب ہوتا ہے جو ابنائے نوع کے کفر و انکار پر بری طرح تڑپتا ہے، ان کے انجامِ بد کے تصور سے اس پر غم و اندوہ کی جو حالت طاری ہوتی ہے اس سے اس پر عین عالم شباب میں بڑھاپے کے آثار طاری ہو جاتے ہیں اور وحی الٰہی کو بار بار تسلی و تشفی ہی نہیں محبت آمیز تنبیہ بھی کرنی پڑتی ہے کہ: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۝ — اور لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا ۝ — اے رسولؐ کیا تم ان کے کفر و انکار پر صدمے سے اپنے آپ کو ہلاک کر لوگے؟ ہم نے یہ قرآن تم پر اس لئے نہیں اتارا کہ تم ایسی سخت مشقت میں پڑ جاؤ — طٰهٰ ۝ مَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ ۝

بات طویل ہو جائے گی۔ دعوت کے اس ابتدائی مرحلے کے بعد تعذیب و ابتلا کا جو دور شروع ہوا اور جن صبر آزما اور جاں گسل حالات سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقائے کرام کو گذرنا پڑا وہ اپنی جگہ ایک مستقل موضوع ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا میں اپنی آج کی گفتگو کو 'دعوت الی اللہ' کی صرف ابتدائی منزلوں تک محدود رکھنا چاہتا ہوں — البتہ اس گفتگو کو ختم کرنے سے قبل میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خطبہ آپ کو ضرور سنانا چاہتا ہوں جو یقیناً اسی ابتدائی دور کا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہو گا کہ 'دعوت الی اللہ' کے اساسی و بنیادی نکات کیا ہیں اور اس میں اوّل اوّل کن امور پر زور دیا جاتا ہے! خطباتِ نبوی کی کتابوں میں یہ خطبہ ان الفاظ میں نقل ہوا ہے۔

"اِنَّ الرَّائِدَ لَا يَكْذِبُ أَهْلَهُ ۔	لوگو! تم جانتے ہو کہ رائد اپنے قافلے والوں کو کبھی دھوکا نہیں دیتا۔
وَاللّٰهِ لَوْ كَذَبْتُ النَّاسَ جَمِيعًا مَا كَذَبْتُكُمْ وَلَوْ غَرَرْتُ النَّاسَ جَمِيعًا مَا غَرَرْتُكُمْ ۔	خدا کی قسم! اگر (بالفرض محال) میں تمام انسانوں سے جھوٹ کہہ سکتا تب بھی تم سے کبھی نہ کہتا اور اگر تمام انسانوں کو فریب دے سکتا تب بھی تمہیں کبھی نہ دیتا۔
وَاللّٰهِ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ إِنِّي لَرَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ خَاصَّةً وَإِلَى النَّاسِ كَافَّةً ۔	اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، میں اللہ کا رسول ہوں، تمہاری طرف خصوصاً اور پوری نوعِ انسانی کی طرف عموماً!
وَاللّٰهِ لَتَمُوتُنَّ كَمَا تَنَامُونَ ۔ ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُونَ ۔	خدا کی قسم تم سب مر جاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو! پھر یقیناً اٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہو جاتے ہو
ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُونَ	پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہو گا۔
ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْإِحْسَانِ إِحْسَانًا وَبِالسُّوءِ سُوءًا ۔	اور پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا۔ اچھائی کا اچھا اور برائی کا برا۔
وَإِنَّهَا الْجَنَّةُ أَبَدًا أَوِ النَّارُ أَبَدًا "	اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لئے یا آگ ہے دائمی۔

اپنے اس خطبے میں بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نبی کے لئے انتہائی بلیغ مثال رائد کی دی ہے۔ رائد کسی قافلے کا وہ معتمد ترین فرد ہوتا تھا جو سفر کی اگلی منزل کا تعین کرتا تھا اور قافلے سے آگے جا کر معلوم کرتا تھا کہ کس جگہ پڑاؤ مناسب رہے گا کہ پانی اور چارے کی سہولتیں فراہم ہوں۔ ظاہر ہے کہ رائد کے صدق و امانت پر ہی پورے قافلے کی سلامتی کا دار و مدار تھا اور اس کی ذرا سی غلط بیانی پورے قافلے کی ہلاکت کا سبب بن سکتی تھی — یہی حال نبی کا ہوتا ہے کہ وہ قافلۂ دنیا کو منزلِ آخرت کی خبر دیتا ہے اور یہاں کی مدہوشی و غفلت پر وہاں کے دردناک انجام سے خبردار کرتا ہے — اس انتہائی بلیغ پیرائے میں اپنے مقام و منصب کو واضح فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی توحید اور اپنی رسالت کی خبر دیتے ہیں اور پھر پورا زور اس بات پر صرف کر دیتے ہیں کہ غافلو ہوشیار ہو جاؤ — نیند کے ماتو جاگو — جیسے روزانہ شام ہوتی ہے ایسے ہی تمہاری پوری زندگی کے دن پر بھی ایک شام آئے گی، اور جس طرح تم پر روز نیند طاری ہو جاتی ہے اسی طرح اس شام کو موت تمہیں اپنی آغوش میں لے لے گی — پھر جس طرح تم روزانہ صبح بیدار ہو جاتے ہو اسی طرح ایک دن تمہیں موت کی نیند سے اٹھایا جائے گا۔ (فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ۝ عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ ۝)[1] پھر تمہارے زندگی بھر کے اعمال کا حساب ہو گا اور پھر بدلہ مل کر رہے گا۔ بھلائی کا بھلائی سے یعنی ہمیشہ کے لئے جنت اور برائی کا برائی سے یعنی ہمیشگی کی آگ!! اس سے معلوم ہوا کہ دعوت الی اللہ کے بنیادی اور اساسی نکات

[1] سورۂ مدثر: پھر وہ دن بڑا ہی سخت دن ہے۔ منکروں پر ہرگز آسان نہیں!

تو تین ہی ہیں یعنی توحید، رسالت اور معاد لیکن ان میں بھی ابتداءً اصل زور آخرت کے محاسبے اور جزا و سزا سے خبردار کرنے پر ہونا چاہئے پورا قرآن مجید اور خصوصاً ابتدائی مکیات اس پر شاہد عادل ہیں، اور دعوت کا جو پہلا حکم آں حضور کو دیا گیا وہ تو اس پر آخری دلیل اور قطعی حجت ہے۔ ارشاد ہوا يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنذِرْ "اے کپڑے میں لپٹ کر لیٹنے والے! کھڑا ہو اور خبردار کر!" اور "وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ" "اور ڈرا اپنے قریبی رشتہ داروں کو" — دنیا میں نظامِ دین و شریعت کا نفاذ قیامِ دعوتِ الی اللہ کا ہدف تو یقیناً ہے۔ لیکن اسے ہدفِ بعید کہنا چاہئے، اس کا اولین ہدف ابنائے نوع کی اخروی فلاح و نجات ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اور تمہاری مثال ایسی ہے کہ جیسے آگ کا ایک بڑا الاؤ ہے اور تم اس میں گرے پڑتے ہو اور میں تمہیں کمر سے پکڑ پکڑ کر اس میں گرنے سے روک رہا ہوں — پھر ظاہر ہے کہ جس سے جتنی زیادہ محبت ہو اتنا ہی وہ اس دعوت میں مقدم ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور خاص اپنے گھرانے کے افراد کو رک رک کر متنبہ کرتے تھے اور فرماتے تھے۔ یا فاطمة بنت محمد انقذی نفسك من النار فانی لا املك لك من الله شيئاً ويا صفية عمة رسول الله انقذی نفسك من النار فانی لا املك لك من الله شيئاً۔ اے فاطمہ، محمد کی بیٹی، اور اے صفیہ اللہ کے رسول کی پھوپھی! خود اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کرو، اس لئے کہ اللہ کے یہاں مجھے تمہارے بارے میں کوئی اختیار نہ ہو گا!"

حضرات! یہ ہیں دعوت الی اللہ کے اصول و مبادی اور یہ ہے اس کا اسلوب و منہج۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو آج کی اس مجلس سے یہ فیصلہ کر کے اٹھیں کہ ہم ان اصول اور اس اسلوب پر "دعوتِ الی اللہ" کا کام کریں گے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی "سنت دعوت" کا اتباع کریں گے — میں نے اپنی اس گفتگو کو دعوت کے ابتدائی مراحل تک اس لئے محدود رکھا ہے کہ مجھے یقین ہے اور میں علی وجہ البصیرت جانتا ہوں کہ اگر اس اسلوب پر دعوت الی اللہ کے چھوٹے چھوٹے چراغ اور ننھے ننھے دیے ہمارے شہروں، بستیوں اور قصبوں میں روشن ہو گئے تو پھر اس دعوت کے اعلیٰ مقامات اور بلند تر منازل کا سامان بھی فراہم ہو جائے گا اور نہ صرف یہ کہ ایک ایسی اجتماعی قوت بہم پہنچ جائے گی جو امتِ محمدی کے جملہ اخلاقی و روحانی عوارض کا مداوا کرے اور "وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ" کی مصداق بن جائے بلکہ وہ دن بھی دور نہ رہے گا جب یہ امت بحیثیت مجموعی دعوت

---

[1] سورہ آل عمران: "اور چاہئے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم دیتا رہے اچھے کاموں کا اور منع کرے برائی سے — اور وہی پہنچے اپنی مراد کو!"

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ نساء

(۹)

۲۳- آگے کا مضمون، آیات ۱۰۵- ۱۱۵

آگے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ ہدایت فرمائی کہ اللہ نے تمہیں جو کتاب عطا فرمائی ہے اب یہی حق و باطل کی کسوٹی ہے، تم اسی کسوٹی پر پرکھ کے لوگوں کے ساتھ معاملہ کرو۔ جو اس پر پورے اتریں وہ مومن و مخلص ہیں، جو اس پر کھوٹے ثابت ہوں وہ عہد شکن اور غدار ہیں، تم خدا کے حضور میں ان کے سفارشی اور وکیل نہ بنو، خدا ایسے بدعہدوں اور گنہگاروں کو پسند نہیں کرتا۔ آیت ۸۸ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ الآیۃ میں جس بات کی طرف اجمالاً اشارہ فرمایا تھا اب یہ اس کی تفصیل آگئی ہے۔ وہاں یہ بات گزر چکی ہے کہ مسلمانوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے دل میں منافقین کے لیے بڑا نرم گوشہ رکھتے تھے، وہ ان کو ہر جا و بیجا رعایت دینے کی کوشش کرتے اور بسا اوقات ان معاملات میں بھی انھیں معذور ٹھہراتے جن میں معذور ٹھہرانے کی گنجائش نہ ہوتی۔ یہ رویہ اگرچہ طبیعت کی نرمی ہی کی بنا پر ہو لیکن اس اعتبار سے بالکل غلط ہے کہ خدا کی کتاب جنھیں معذور نہ ٹھہرائے ہوا انھیں معذور ٹھہرانا اور ان کی حمایت کرنا نفاق کو شہ دینے بلکہ اس کی پرورش کرنے کے ہم معنی ہے۔ چنانچہ یہاں سب سے پہلے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس چیز سے روکا۔ حضور کی طرف یہ خطاب اسی طرح کا ہے جس کی متعدد مثالیں اس کتاب میں گزر چکی ہیں اور ہم نے واضح کیا ہے کہ ان میں خطاب کا رخ تو حضور کی طرف ہوتا ہے لیکن ان میں جو عتاب مضمر ہوتا ہے اس کا رخ ان لوگوں کی طرف ہوتا ہے جو اس غلطی کے مرتکب ہو رہے ہوتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرنے کے بعد براہِ راست ان مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی جو ان منافقین کی حمایت کرتے تھے کہ اس دنیا میں تو تم ان کی حمایت کر رہے ہو لیکن آخرت میں ان کی حمایت کون کرے گا؟ اس کے بعد فرمایا کہ صحیح طریقہ نہ تو یہ ہے کہ اپنی غلطی کی حمایت کی جائے اور نہ یہ ہے کہ جب کسی پر گرفت ہو تو وہ اپنے بوجھ کو کسی بے گناہ پر لادنے کی کوشش کرے، بلکہ توبہ و استغفار ہے۔ یہ تنبیہ اس لیے فرمائی گئی کہ منافقین اول تو اپنی کوئی غلطی تسلیم نہیں کرتے تھے اور اگر کوئی غلطی اس طرح گرفت میں آجاتی کہ اس کی ذمہ داری سے بچنے کی کوئی سبیل ان کو نظر نہ آتی تو جھوٹ اور بہتان کے ذریعے سے اس کو کسی بے گناہ کے سر تھوپنے کی کوشش کرتے۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ محض اللہ کا فضل و احسان اور اس کی بخشی ہوئی کتاب و حکمت کی برکت ہے کہ تم ان منافقین کے فتنوں اور ان کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہے ورنہ انھوں نے تو تمہیں راہ حق سے ہٹانے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

اس کے بعد منافقین کی مفسدانہ سرگرمیوں پر ان کو تنبیہ فرمائی ہے کہ جو لوگ حق واضح ہو جانے کے بعد رسول کی عداوت اور مسلمانوں کے طریقہ کی مخالفت میں یہ سرگرمیاں دکھا رہے ہیں ان کو اللہ اسی راہ پر موڑ دے گا جس کو انھوں نے اپنے لیے اختیار کیا ہے اور یہ راہ جہنم کی راہ ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ
اللَّهُ ۚ وَلَا تَكُنْ لِلْخَائِنِينَ خَصِيمًا ۝ وَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا
رَحِيمًا ۝ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنْفُسَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ
كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ۝ يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ
مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ۝
هَا أَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَمَنْ يُجَادِلُ اللَّهَ
عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَمْ مَنْ يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ
نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ وَمَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا
يَكْسِبُهُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وَمَنْ يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا

ثُمَّ يَرْمِ بِهِ بَرِيئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا ۝ وَلَوْلَا
فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ أَنْ يُضِلُّوكَ وَمَا
يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ ۖ وَمَا يَضُرُّونَكَ مِنْ شَيْءٍ ۚ وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ
وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۚ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا ۝
لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِنْ نَجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ
بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ
أَجْرًا عَظِيمًا ۝ وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَ
يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَ
سَاءَتْ مَصِيرًا ۝

ترجمہ

ہم نے یہ کتاب تم پر حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں دکھایا ہے اور تم بدعہدوں کے حمایتی نہ بنو۔ اور اللہ سے مغفرت مانگو، بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔ اور ان لوگوں کی وکالت نہ کرو جو اپنے آپ سے خیانت کر رہے ہیں۔ اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو بدعہد اور حق تلف ہیں۔ یہ لوگوں سے تو چھپتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپتے حالانکہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب کہ وہ ناپسندیدہ سرگوشیاں کرتے ہیں اور اللہ، جو کچھ وہ کرتے ہیں سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ۱۰۵-۱۰۸

یہ تم ہو جنھوں نے دنیا کی زندگی میں ان کی مدافعت کی تو قیامت کے دن اللہ سے کون ان کی مدافعت کرے گا یا کون ان کا ذمہ دار بنے گا! اور جو کسی بدی کا ارتکاب کرے یا اپنی جان پر کوئی ظلم ڈھائے، پھر اللہ سے مغفرت چاہے تو وہ اللہ کو بخشنے والا، رحم کرنے والا پائے گا اور جو کسی بدی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا وبال اسی پر آتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے اور جو کسی غلطی یا گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگاتا ہے تو اس نے اپنے سر ایک بہت بڑا بہتان اور گناہ لیا۔ ۱۰۹-۱۱۲

اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ

نے تو یہ ٹھان ہی لی تھی کہ تمھیں بے راہ کر کے رہے گا حالانکہ یہ اپنے آپ ہی کو بے راہ کر رہے ہیں۔ تمھارا کچھ نہیں بگاڑ رہے ہیں۔ اور اللہ نے تم پر کتاب و حکمت نازل فرمائی اور تمھیں وہ چیز سکھائی جو تم نہیں جانتے تھے اور اللہ کا تم پر بڑا فضل ہے۔ ۱۱۳

ان کی سرگوشیوں کا زیادہ حصہ ایسا ہے جس میں کوئی خیر نہیں۔ خیر والی سرگوشی تو صرف اس کی ہے جو صدقہ کی صلاح دے یا کسی نیکی کی راہ سجھائے یا اصلاح ذات البین کی دعوت دے۔ جو اللہ کی رضا جوئی میں ایسا کریں گے تو ہم ان کو اجر عظیم عطا فرمائیں گے اور جو کوئی راہ ہدایت واضح ہو چکنے کے بعد رسول کی مخالفت کرے گا اور مسلمانوں کے راستے کے سوا کسی اور راستے کی پیروی کرے گا تو ہم اس کو اسی راہ پر ڈالیں گے جس پر وہ پڑا اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ ۱۱۴-۱۱۵

۲۳۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ
وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا ۝ وَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝
وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا
أَثِيمًا ۝ يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ
مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ۝ ۱۰۵-۱۰۸

'اراءت' کا لفظ قرآن میں اس وحی کے لیے بھی آیا ہے جو انبیا علیہم السلام کو رویا میں ہوتی ہے جیسا کہ انفال آیت ۴۳ میں ہے اور اس رہنمائی کے لیے بھی آیا ہے جو وحی متلو کے ذریعے سے ہوتی ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ اس لفظ کے معنی چونکہ دکھا دینے کے ہیں اس وجہ سے اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ پیغمبر کو وحی کے ذریعے سے جو رہنمائی ملتی ہے وہ گویا چشم سر سے حقائق کا مشاہدہ ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے لیے اس سے ہٹ کر کوئی راہ اختیار کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ آگے آیت ۱۱۳ میں بھی یہ مضمون آ رہا ہے۔

'مجادلہ' کا لفظ قرآن میں اچھے اور برے دونوں معنوں میں آیا ہے۔ اس کے معنی مناظرہ، کٹ حجتی اور جھگڑنے کے بھی ہیں اور اعتماد و توکل کی بنیاد پر کسی سے شکوہ کرنے اور اصرار و الحاح کے ساتھ کسی کے حق میں سفارش کرنے کے بھی ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کا مجادلہ قوم لوط کے بارے میں اور سورۂ مجادلہ میں جس مجادلہ کا ذکر ہے وہ اسی نوع کا ہے۔

'الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ' سے مراد منافقین ہیں جن کا ذکر 'خائنین' کے لفظ سے ہوا ہے۔

خیانت اس بے وفائی اور غداری کے لیے ایک معروف لفظ ہے جو بیوی اپنے شوہر سے کرتی ہے۔ جس طرح ایک بے وفا عورت اپنے آپ کو جائز عقد میں تو کسی اور مرد کے دیتی ہے لیکن عشق کی پینگیں کسی اور کی طرف بڑھاتی ہے اسی طرح منافقین اطاعت و وفاداری کا عہد تو اللہ اور رسول سے کرتے ہیں لیکن دم دوسروں کا بھرتے ہیں۔ ان کی اس خیانت کی بابت ارشاد ہوا کہ یہ خود اپنے آپ سے خیانت کر رہے ہیں اس لیے کہ ان کی اس خیانت سے خدا اور رسول کا کچھ نہیں بگڑتا، بگڑتا انھی کا ہے لیکن ان کو نظر نہیں آتا۔ علاوہ ازیں اس میں یہ پہلو بھی ہے کہ یہ خود اپنے ضمیر کی نگاہوں میں مجرم ہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ یہ سامنے کیا کر رہے ہیں اور پیٹھ پیچھے کیا کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کی وکالت کرنا 'مدعی سست گواہ چست' کا مصداق بنتا ہے۔

'ولا تکن'، 'واستغفر اللہ' 'ولا تجادل' میں بظاہر خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس میں عتاب کا رخ ان مسلمانوں کی طرف ہے جو منافقین کی حمایت کرتے تھے۔ اس طرح کے خطاب، جیسا کہ ہم اس کتاب میں متعدد مقامات میں واضح کر چکے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت امت کے وکیل کے ہوتے ہیں۔ آپ کو مخاطب کر کے بات کہی جاتی ہے۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ یہ حرکتیں کر رہے ہیں وہ ان سے باز آئیں۔ اس اسلوب میں یہ بلاغت بھی ہوتی ہے کہ ان لوگوں سے ایک قسم کی بے التفاتی و بے پروائی کا اظہار ہوتا ہے جن کو سرزنش مقصود ہوتی ہے گویا وہ لائق خطاب نہیں۔ اسی وجہ سے اللہ نے اپنے رسول کو مخاطب کر کے جو بات فرمانی تھی وہ فرما دی۔ قرآن مجید میں اس طرح کے جو خطاب وارد ہوتے ہیں بالعموم کلام کے تدریجی ارتقا سے ان کا اصلی رخ بھی واضح ہو گیا ہے کہ خطاب فی الحقیقت کن سے ہے چنانچہ یہاں بھی آگے والی آیت 'هَا أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ' الآیہ نے واضح کر دیا ہے کہ اس میں اشارہ کن کی طرف ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الآیہ کے اسلوب میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ اور رسول اور مومنین کی پسند اور ناپسند کا معیار الگ الگ نہیں ہو سکتا۔ جن صفات و کردار کے لوگوں کو اللہ پسند نہیں کرتا، کس طرح ممکن ہے کہ رسول اور مومنین اسے پسند کریں۔ اگر کچھ لوگ ایسے ہیں جو ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ان لوگوں کو بھی پسند کرتے ہیں جو اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں تو وہ خود سوچ لیں کہ ان کی یہ بات کہاں تک پہنچتی ہے۔

اجزائے کلام کی وضاحت کے بعد آیات کا مدعا چنداں وضاحت طلب نہیں رہا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے کتاب جو اتاری ہے حق کے ساتھ اتاری ہے۔ اس وجہ سے اب حق و باطل کے درمیان امتیاز کے لیے کسوٹی یہی ہے۔ اسی کسوٹی پر پرکھ کر تمھیں لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنا ہے کہ کون حق پر ہے کون باطل پر، کون مخلص ہے کون منافق۔ یہ اللہ کی دی ہوئی روشنی اور اس کی دکھائی ہوئی راہ ہے جس کے بعد تمھارے لیے کوئی بھٹکنے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اس وجہ سے تم ان لوگوں کے حمایتی اور وکیل نہ بنو جو اللہ اور رسول سے بدعہدی اور خیانت کر رہے ہیں۔ تم اللہ سے مغفرت مانگو، اللہ بڑا غفور رحیم ہے۔ جو لوگ اللہ سے بدعہدی کر رہے ہیں وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ رہے ہیں بلکہ خود اپنے نفس سے بدعہدی کر رہے اور اپنے قلب و ضمیر کے مجرم ہیں۔ خدا ایسے بدعہدوں اور حق تلفوں کو پسند نہیں کرتا تو جو خود اپنے ضمیر کی عدالت میں مجرم اور خدا کے مبغوض ہیں ان کی مدافعت تم کیوں کرو؟ فرمایا کہ یہ انسانوں سے تو چھپتے ہیں اور چھپ چھپ کر اللہ و رسول کے خلاف سرگوشیاں کرتے ہیں لیکن اس اللہ سے کہاں چھپ سکتے ہیں جو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ اپنی ان ناپسندیدہ سرگوشیوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ اللہ کا علم تو ہر چیز کو محیط ہے۔

ان منافقین کی در پردہ سازشوں اور سرگوشیوں کا ذکر اس سورہ کی آیت ۸۱ میں بھی گزر چکا ہے، وہاں بھی دیکھیے۔ اس پر تفصیلی بحث ان شاء اللہ سورہ مجادلہ میں ہوگی۔

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فَمَنْ یُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَمْ مَّنْ یَّكُوْنُ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا ۝ وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ یَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝ وَمَنْ یَّكْسِبْ خَطِیْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ یَرْمِ بِهٖ بَرِیْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِیْنًا ۱۰۹-۱۱۲

'ھا' عربی میں کلمۂ تنبیہ ہے۔ اس پر دوسرے مقام میں بحث گزر چکی ہے۔ یہ جملے کے شروع میں آتا ہے اور مقصود اس سے یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کان کھول کر بات سنے۔

لفظ 'وکیل' کے ساتھ جب 'علیٰ' ہو تو موقع کے لحاظ سے یہ تین معنوں میں آتا ہے۔

۱۔ مسئول اور ذمہ دار کے معنی میں۔ مثلاً وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا وَمَاۤ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِوَكِیْلٍ ۱۰۷ انعام (ہم نے تم کو ان پر نگران نہیں بنایا ہے اور تم ان کے ایمان کے باب میں مسئول نہیں ہو۔)

۲۔ نگران کے معنی میں۔ مثلاً خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ۱۰۲ انعام (وہ ہر چیز کا خالق ہے، پس اسی کی بندگی کرو اور وہی ہر چیز پر نگران ہے)

۳۔ ضامن کے معنی میں۔ مثلاً اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَیَّ وَاللّٰهُ عَلٰی مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ ۲۸ قصص (دونوں میں سے جو مدت بھی میں پوری کر دوں تو مجھ پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی اور ہم جو قول و قرار کر رہے ہیں اس پر اللہ ضامن ہے)

ظاہر ہے کہ 'اَمْ مَّنْ یَّكُوْنُ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا' میں یہ پہلے معنی میں ہے۔ یعنی آج تو ان کی حمایت کرنے والے ان کی حمایت میں لڑ جھگڑ سکتے ہیں لیکن قیامت کے دن جب خدائے علیم و خبیر کی عدالت میں ان کا مقدمہ پیش ہوگا تو ان کی طرف سے کون مسئول اور جواب دہ بن کر کھڑا ہوگا۔ اس دن تو بہرحال انھیں خود ہی جواب دہی کرنی ہوگی۔

اب یہ کھل کر بات سامنے آگئی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے اوپر کی آیات میں کن کے رویے پر سرزنش کی گئی تھی۔ معلوم ہوا کہ مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم شخصاً نہیں تھے بلکہ مسلمانوں میں سے وہ لوگ تھے جو وقتاً فوقتاً اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر منافقین کی حمایت میں آستینیں چڑھا لیتے اور ان کی صریح غلطیوں کے باوجود ان کی برأت کے لیے کوئی نہ کوئی عذر تلاش کرنے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ لوگو، کان کھول کر سن لو کہ آج تو تم ان کی حمایت میں لڑ جھگڑ سکتے ہو لیکن کل جب خدا کے ہاں ان کی روبکاری ہوگی تو خدا سے ان کی مدافعت میں کون جھگڑے گا یا کون ان کی طرف سے مسئول بنے گا۔ اس کے بعد فرمایا کہ خدا سے چھوٹنے کا راستہ یہ نہیں ہے کہ مجرم کی حمایت میں دوسرے پشت پناہ بن کر کھڑے ہوں بلکہ یہ ہے کہ اگر کسی سے کوئی برائی یا کسی ظلم نفس (شرک) کا ارتکاب ہو جائے تو وہ اللہ کی طرف رجوع کرے اور اس سے مغفرت مانگے، جو شخص خلوص

کے ساتھ استغفار کرے گا وہ اللہ کو بخشنے والا اور مہربان پائے گا۔ خدا کے ہاں ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھائے گا، جو کسی گناہ کا مرتکب ہوگا اس کا وبال اسی پر آئے گا، اس لیے کہ خدا علیم بھی ہے اور حکیم بھی۔ اس کے علم اور اس کے عدل و حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ زید کا حساب بکر کے کھاتے میں نہ پڑنے پائے بلکہ ہر ایک اپنے عمل کا جواب دہ خود بنے۔

'وَمَن یَکسِب خَطِیٓئَۃً' الآیۃ میں منافقین کی ایک اور شرارت سے پردہ اٹھایا کہ یہ لوگ اپنی کسی غلطی یا کسی حق تلفی پر جب گرفت میں آ جاتے ہیں تو اعتراف کے بجائے جھوٹ اور بہتان کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اس کا بوجھ کسی بے گناہ پر لادنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرمایا کہ خدا سے برئیت کا یہ راستہ بھی غلط ہے۔ اس بہتان اور جھوٹ سے دنیا کو دھوکا دیا جا سکتا ہے، خدا کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ خدا کے ہاں ایسے مجرم نہ صرف اپنے جرم کا بوجھ اٹھائیں گے بلکہ اپنے اصل جرم پر بہتان اور جھوٹ کا بھی اضافہ کریں گے۔ یہ بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ اوپر منافقین کی سازشوں اور سرگوشیوں کا ذکر گزر چکا ہے۔ سازشی گروہوں کا خاص حربہ اپنے دفاع کے لیے یہی ہوتا ہے کہ جب وہ پکڑے جاتے ہیں تو اس کا الزام یا تو دوسرے بے گناہوں کے سر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں یا کم از کم ان کو بھی اس میں ملوث کرنے کے لیے بہتان طرازی کرتے ہیں تاکہ اپنا بارِ گناہ کچھ ہلکا کر لیں۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ وَرَحْمَتُہٗ لَہَمَّتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْھُمْ اَنْ یُّضِلُّوْکَ وَمَا یُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَضُرُّوْنَکَ مِنْ شَیْءٍ وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا۔ ۱۱۳

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات اور آپ کے واسطے سے مسلمانوں کو تنبیہ ہے کہ یہ اللہ کا تمہارے اوپر خاص فضل و احسان ہے کہ تم ان منافقین کے شر سے محفوظ رہے ورنہ ان کی ایک جماعت کی تو ساری کوشش اور سازش یہی ہے کہ تمہیں راہ سے بے راہ کر کے رہے لیکن اللہ نے اپنے فضلِ خاص سے تمہیں کتاب و حکمت کی جو روشنی عطا فرمائی ہے اس نے تمہیں ہر لغزش سے محفوظ رکھا۔ اس میں مسلمانوں کو یہ تنبیہ ہے کہ اس گروہ کی آفتوں اور فتنوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں اور ساتھ ہی اس سے محفوظ رہنے کی تدبیر بھی بتا دی کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کتاب و حکمت کی جو نعمت ان کو ملی ہے اس کی پیچھے دل سے قدر کریں اور ان لوگوں کے چکموں میں نہ آئیں جو اس سے ہٹ کر اپنی راہ نکال رہے ہیں۔

'وَمَا یُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَضُرُّوْنَکَ مِنْ شَیْءٍ' میں اس حقیقت نفس الامری کا بیان ہے کہ راہ حق سے منحرف ہو کر چلنے والے اگر راہِ حق پر چلنے والوں کو حق سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں تو پھر وہ اپنی تمام دانش فروشیوں کے باوجود صرف اپنے ہی کو گمراہ کرتے ہیں۔ جادۂ حق پر استوار رہنے والوں کو وہ کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے موقف حق پر ڈٹے ہوئے دیکھتے رہو کہ یہ تباہی کے کس گڑھے میں جا کر گرتے ہیں۔

لَا خَیْرَ فِیْ کَثِیْرٍ مِّنْ نَّجْوٰھُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَۃٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَیْنَ النَّاسِ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ فَسَوْفَ نُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا۔ وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُ الْھُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِہٖ جَھَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا۔ (۱۱۴-۱۱۵)

نجویٰ کے معنی سرگوشی اور رازداری کے انداز میں کسی سے بات کرنے کے ہیں۔ اس میں بجائے خود کوئی برائی نہیں ہے اس لیے کہ ایسے مواقع بہت سے ہو سکتے ہیں جہاں رازداری اور سرگوشی کا طریقہ ہی قرین مصلحت ہوتا ہے۔ ہر جگہ اور ہر موقع پر اعلان و نمایش ضروری نہیں ہے۔ اس میں برائی یا بھلائی بات کی نوعیت سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر بات نیکی اور تقویٰ کی ہے تو وہ نجویٰ خیر ہے اور اگر بات شرارت اور فتنے کی ہے تو وہ نجویٰ شیطانی ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کی وضاحت سورۂ مجادلہ میں فرما دی ہے۔ 'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَیْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ... وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰی' - ۹ (اے ایمان والو، جب تم آپس میں رازداری کے ساتھ بات کرو تو گناہ اور تعدی کی مشورت نہ کرو بلکہ نیکی اور تقویٰ کی بات کرو)

'اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَۃٍ' میں ایک مضاف محذوف ہے جس طرح 'وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ' میں ہے جس کا ذکر بقرہ میں گزر چکا ہے۔ یعنی ان کا نجویٰ تو بیشتر شیطانی ہوتا ہے البتہ اُن کے نجویٰ میں خیر ہے جو صدقہ، نیکی اور اصلاح کے لیے نجویٰ کریں۔

'مشاقۃ' اور 'ھدیٰ' کے الفاظ پر سورۂ بقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔ رسول کے ساتھ مشاقہ کے معنی ہیں رسول کے مقابل میں اپنی ایک پارٹی کھڑی کرنے کی کوشش کرنا اور 'ھدیٰ' کے معنی ھُدَی اللّٰہ یعنی اللہ کی ہدایت کے ہیں جس طرح 'الکتٰب' کے معنی کتاب اللہ کے۔

'سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ' میں مومنین سے مراد صحابۂ رسول ہیں۔ انھوں نے زندگی کا جو طریقہ اختیار کیا وہ سرتاسر ہدایت الٰہی پر مبنی تھا اس وجہ سے اس کی اتباع ہی اللہ اور رسول کی اتباع ہے۔

اس سے ہٹ کر کوئی راہ نکالنا گزیر ہے۔

نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى میں وہی اسلوب ملحوظ ہے جو فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ میں ہے یعنی جو لوگ اہل ایمان کے راستے سے ہٹ کر کوئی راہ نکالنے کی کوشش کریں گے خدا ان کو اسی راہ پر موڑ دے گا جس پر وہ جانا چاہتے ہیں۔ حق کے ترک و اختیار کے معاملے میں خدا کے ہاں جبر نہیں ہے جو خدا کی راہ پر چلنا چاہتا ہے اللہ اس کو اس کی توفیق ارزانی فرماتا ہے جو اس سے الگ ہو کر اپنی پسند کردہ کوئی راہ اختیار کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کے لیے بھی اس کو ڈھیل دے دیتا ہے۔

اوپر آیت ۱۰۸ میں اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ کے الفاظ سے منافقین کی جن سرگوشیوں اور سازشوں کی طرف اشارہ فرمایا تھا اب یہ اس کی وضاحت ہو رہی ہے کہ ان کی سرگوشیوں کا اکثر حصہ خیر سے بالکل خالی محض فتنہ و فساد کی باتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بابرکت سرگوشی تو ان کی ہو سکتی ہے جو صدقے کی ترغیب، نیکی کی تشویق اور اصلاح ذات البین کے مقصد سے ہو اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو اللہ کی رضا جوئی کے لیے درپردہ ان اعلیٰ مقاصد کے لیے کام کریں گے اللہ ان کو بڑا اجر دے گا۔

اس کے بعد فرمایا کہ جو لوگ یہ اچھی طرح سمجھ چکنے کے بعد کہ رسول جس طریق ہدایت کے داعی ہیں یہ اللہ کی اتاری ہوئی ہدایت ہے، رسول کی مخالفت کر رہے ہیں اور اہل ایمان کے اختیار کیے ہوئے طریقے کو چھوڑ کر کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہتے ہیں اللہ ان کو ان کی اختیار کی ہوئی راہ پر جانے کے لیے چھوڑ دے گا اور یہ اس راہ سے سیدھے جہنم میں پہنچ جائیں گے جو نہایت برا ٹھکانا ہے۔

ان دونوں آیتوں پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ قرآن نے نہایت بلیغ اسلوب سے ان منافقین کے نجوی کی نوعیت بھی واضح کر دی ہے اور اس کا مقصد بھی بے نقاب کر دیا ہے۔ جب یہ فرمایا کہ ان کے نجوی میں کوئی خیر نہیں۔ بجائے خیر تو ان کا نجوی ہے جو صدقہ پر ابھاریں، معروف پر چلنے کی ترغیب دیں اور اصلاح ذات البین کی کوشش کریں تو اس سے یہ بات آپ سے آپ نکل آئی کہ یہ لوگ جو سرگوشیاں کرتے ہیں اس میں یہ لوگوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتے ہیں، معروف کے بجائے منکر کی ترغیب دیتے ہیں اور اصلاح ذات البین کے بجائے مسلمانوں میں نفاق ڈلوانے کی سازش کرتے ہیں۔

اسی طرح جب یہ فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی ہدایت اچھی طرح واضح ہو چکنے کے بعد رسولؐ کی اور اللہ کی ہدایت کی مخالفت کر رہے ہیں اور مسلمانوں کے راستے سے الگ اپنی ایک پگڈنڈی نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں اللہ ان کو ان کی پسند کردہ راہ پر جانے کے لیے چھوڑ دے گا جو ان کو سیدھے جہنم میں لے جا کے گرائے گی تو گویا یہ واضح کر دیا کہ ان لوگوں کی ان تمام سازشوں اور سرگوشیوں کا مدعا درحقیقت یہ ہے کہ یہ رسول کے بالمقابل اپنی ایک الگ پارٹی بنانا، ہدی اللہ کے بالمقابل اپنی ایک علیحدہ ڈگر نکالنا اور طریقۂ مومنین کے بالمقابل طریقۂ جاہلیت کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔

میں جب ان آیات کو پڑھتا ہوں تو میرا ذہن بار بار اس بات کی طرف جاتا ہے کہ ان میں ان لوگوں کو جواب دیا گیا ہے جو ان منافقین کی حمایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین مخلصین سے بحثیں اور مناظرے کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان منافقین کی ان خفیہ مجلسوں اور درپردہ سازشوں کی اطلاعات جب حضورؐ کو اور صحابہؓ کو پہنچتی رہی ہوں گی تو ان پر کسی نہ کسی نوعیت سے گرفت بھی ہوتی رہی ہو گی۔ اس وقت ان کے یہ حامی جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، ان کی صفائی میں کہتے رہے ہوں گے کہ یہ لوگ تو بڑے مخلص ہیں، یہ تو ملت کے بڑے بہی خواہ ہیں، ان کی مجلسوں میں جو باتیں ہوتی ہیں وہ اسلام اور مسلمانوں کی بہبود اور خیر خواہی کی ہوتی ہیں اور اگر اس ذیل میں کوئی ایسی بات گرفت میں آ جاتی رہی ہو گی جس کا جواب نہ بن آتا رہا ہو گا تو اس کا الزام، جیسا کہ اوپر اشارہ گزرا، کسی ایسے بھلے مانس پر ٹھونک دیتے رہے ہوں گے جس کے حاشیہ خیال میں بھی وہ بات کبھی نہیں آئی ہو گی۔ ان لوگوں کی اس وکالت کے جواب میں قرآن نے نہایت بلیغ طریقے سے ان اندرون خانہ سرگوشیوں سے پردہ اٹھایا اور دیکھیے کتنی خوبصورتی سے پردہ اٹھایا ہے کہ ساری بات بھی سامنے آ گئی اور مخاطب کے لیے کسی بحث و تردید کی گنجائش بھی باقی نہیں رہی۔

۴۳- آگے کا مضمون آیات ۱۱۶-۱۲۶

آگے پہلے وجہ بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ یہ منافقین جو اللہ کی ہدایت واضح ہو چکنے کے بعد رسول کی مخالفت اور مومنین کی راہ سے الگ اپنی راہ نکالنا چاہتے ہیں جہنم میں جو پڑیں گے تو کیوں پڑیں گے؟ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اللہ کی ہدایت کے خلاف کوئی راہ

اختیار کرنا، خدا کے رسول کے خلاف اپنی پارٹی کھڑی کرنا اور مومنین کے راستے سے الگ راہ نکالنا اپنی حقیقت کے لحاظ سے شرک ہے اور اللہ تعالیٰ کا شرک کے متعلق یہ فیصلہ ہے کہ وہ اس کو کبھی معاف فرمانے والا نہیں۔

شرک کی حقیقت

اس کے بعد شرک کے ذکر کے تعلق سے شرک کی حقیقت واضح فرمائی کہ جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ درحقیقت شیطان کے پیرو ہیں۔ اس نے ان کے لیے آرزوؤں کے جو پرفریب دام بچھائے ہیں اس میں وہ پھنس گئے ہیں اور جو کچھ وہ انھیں سجھاتا ہے بالکل اندھے بہرے ہو کر اس کی تعمیل کر رہے ہیں حالانکہ اس کے تمام دعوے بالکل فریب ہیں۔ ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے جس میں داخل ہونے کے بعد اس سے ان کو نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

پھر اہل توحید کی فوز و فلاح کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ بے شک خدا کی ابدی بہشت میں داخل ہوں گے اور ان کے لیے اللہ کے جو وعدے ہیں وہ شیطان کے وعدوں کی طرح محض فریب نہیں ہیں بلکہ سرتاسر حقیقت ہیں اور خدا کی بات سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ جھوٹی آرزوؤں پر جو لوگ جی رہے ہیں، خواہ منافقین ہوں یا اہل کتاب سب دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی کی آرزو بھی پوری ہونے والی نہیں۔ خدا کے ہاں کام آنے والی چیز ایمان اور عمل صالح ہے۔ خدا کی بہشت میں وہی داخل ہوں گے جن کے پاس یہ متاع ہوگی۔ جو اس سے محروم ہوں گے وہ اپنی برائیوں کی سزا بھگتیں گے خواہ کوئی ہو۔

آخر میں فرمایا کہ اصل دین ان لوگوں کا ہے جو اسلام کے پیرو ہیں۔ یہی ملت ابراہیم ہے۔ ابراہیمؑ خدائے واحد کے پرستار تھے اور ان کی اس توحید ہی کی وجہ سے خدا نے ان کو دوست بنایا تھا۔ اس کائنات کی ہر چیز خدا ہی کی ہے اور خدا ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۱۶-۱۲۶

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ
وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿۱۱۶﴾ إِنْ يَدْعُونَ مِنْ
دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا وَإِنْ يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَرِيدًا ﴿۱۱۷﴾ لَعَنَهُ اللَّهُ ۘ وَقَالَ
لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَفْرُوضًا ﴿۱۱۸﴾ وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَ
لَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ ۚ وَمَنْ
يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُبِينًا ﴿۱۱۹﴾

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ﴿۱۲۰﴾ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ
جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا ﴿۱۲۱﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ وَعْدَ
اللَّهِ حَقًّا ۚ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا ﴿۱۲۲﴾ لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ
أَهْلِ الْكِتَابِ ۗ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ
وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ
فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا ﴿۱۲۴﴾ وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا
مِمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۗ وَ
اتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا ﴿۱۲۵﴾ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ
بِكُلِّ شَيْءٍ مُحِيطًا ﴿۱۲۶﴾

ترجمہ

بے شک اللہ اس چیز کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے، اس کے نیچے جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا اور جو اللہ کا شریک ٹھہرائے گا وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔ یہ اس کے سوا پکارتے بھی ہیں تو دیویوں کو اور پکارتے بھی ہیں تو شیطان سرکش کو۔ اس پر اللہ کی پھٹکار ہے! اور اس نے کہہ رکھا ہے کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک معین حصہ ہتھیا کے رہوں گا، ان کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا، ان کو آرزوؤں کے جال میں پھنساؤں گا، ان کو سجھاؤں گا تو وہ چوپایوں کے کان کاٹیں گے اور ان کو سجھاؤں گا تو وہ خدا کی بنائی ہوئی ساخت کو بگاڑیں گے اور جو اللہ کے سوا شیطان کو اپنا کارساز بنائے تو وہ کھلی ہوئی نامرادی میں پڑا۔ وہ ان کو وعدوں کے بہلاوے دیتا ہے، آرزوؤں میں پھنساتا ہے اور شیطان کے وعدے سرتاسر فریب ہیں۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ اس سے گریز کی کوئی راہ نہیں پائیں گے۔ ۱۱۶-۱۲۱

اور جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے ہم ان کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ اللہ کا وعدہ حق ہے اور اللہ سے زیادہ وعدے کا سچا کون ہو سکتا ہے۔ ۱۲۲

آرزوئیں نہ تمھاری پوری ہونی ہیں نہ اہل کتاب کی۔ جو کوئی کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا اور وہ اپنے لیے اللہ کے مقابل کوئی کارساز اور مددگار نہ پاسکے گا۔ اور جو نیکی کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہے تو یہی لوگ ہیں جو جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہوگی۔ ۱۲۳-۱۲۴

اور باعتبار دین اس سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دے درآنحالیکہ خوب کار بھی ہو اور ابراہیم کی ملت کی پیروی کرے جو بالکل یکسو تھا اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنایا اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ۱۲۵-۱۲۶

۳۵۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۝

'دون' کا لفظ اپنے استعمالات کے لحاظ سے ورے اور پرے، نیچے اور اوپر، آگے اور پیچھے دونوں معنوں میں آتا ہے۔ قرینہ معین کرتا ہے کہ کہاں کیا مراد ہے۔ یہاں ظاہر ہے کہ ورے یا نیچے کے معنی میں ہے۔ جس طرح تمام خیر کا منبع توحید ہے یعنی خدا کی ذات، صفات اور اس کے حقوق میں کسی کو ساجھی نہ ٹھہرانا اسی طرح تمام شر کا منبع شرک ہے یعنی خدا کی ذات، صفات اور اس کے حقوق میں کسی کو شریک ٹھہرانا۔ توحید پر قائم رہتے ہوئے انسان اگر کوئی ٹھوکر کھاتا ہے تو وہ غلبۂ نفس و جذبات سے اتفاقی ہوتی ہے یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی غلطی ہی کو اوڑھنا بچھونا بنا لے۔ اس وجہ سے وہ گرنے کے بعد لازماً اٹھتا ہے۔ برعکس اس کے شرک کے ساتھ اگر کسی سے کوئی نیکی ہوتی ہے تو وہ اتفاق ہوتی ہے جس کا اصل منبع خیر یعنی خدا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس وجہ سے وہ بے بنیاد ہوتی ہے۔ مشرک خدا سے کٹ جانے کی وجہ سے لازماً اپنی باگ نفس اور شیطان کے ہاتھ میں دے دیتا ہے اس وجہ سے وہ درجہ بدرجہ صراط مستقیم سے اتنا دور ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے خدا کی طرف لوٹنے کا کوئی امکان ہی

باقی نہیں رہ جاتا تاآنکہ وہ شرک سے توبہ نہ کرے۔ اس وجہ سے خدا کے ہاں شرک کی معافی نہیں ہے۔ البتہ توحید کے ساتھ اگر کسی سے گناہ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہے گا معاف فرما دے گا۔

اوپر ہم نے اشارہ کیا ہے کہ یہاں یہ شرک کا ذکر ان منافقین کے تعلق سے ہوا ہے جو رسول کی ہدایت الٰہی کی اور طریقۂ اہل ایمان کی مخالفت کر رہے تھے۔ خدا کی شریعت اور اس کے قانون کے ہوتے ہوئے اگر کسی اور کے قانون و شریعت کی پیروی کی جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو حق خدا کا ہے اس میں دوسرے کو شریک کر دیا گیا ہے۔ رسول، اللہ کی شریعت لاتا ہے، ہدی اللہ، اللہ کی شریعت ہے، اور اہل ایمان کا طریقہ اسی شریعت پر قائم ہے۔ اب جو لوگ اس سے الگ ہو کر کوئی راہ نکالنے کے درپے ہیں وہ راہ اللہ کی نہیں بلکہ شیطان کی ہے اور اس پر چلنے والے شیطان اور طاغوت کے پیرو ہیں اور یہ چیز اسی طرح شرک ہے جس طرح عالم ان اللہ کے علاوہ اولیاء شرک ہے جس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے[1]۔

'وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ' میں 'لِمَنْ يَّشَآءُ' کی قید بھی قابل غور ہے۔ ایمان کے ساتھ جو گناہ صادر ہو جاتے ہیں ان کی معافی کے ذکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے 'لِمَنْ يَّشَآءُ' (جس کے لیے چاہے گا) کی قید بھی لگائی ہے جو نہایت اہمیت رکھنے والی قید ہے۔ ہم اس کتاب میں بار بار ذکر کر چکے ہیں کہ قرآن سے یہ بات بالکل غیر مشتبہ طور پر ثابت ہے کہ خدا کی کوئی مشیت بھی اس کی حکمت سے الگ نہیں ہے اس وجہ سے یہ معافی انہی کو حاصل ہوگی جو اس کے عدل و حکمت کے تحت اس کے سزاوار ٹھہریں گے۔ اس قید نے اس معاملے میں بیجا جسارت کے تمام دروازے بند کر دیے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس مشیت کے لیے جو قاعدے ضابطے رکھے ہیں وہ اس نے خود قرآن میں بیان فرما دیے ہیں۔

اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ۝ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا

[1] توحید اور شرک کی حقیقت اچھی طرح سمجھنے کے لیے ہماری کتابیں حقیقت توحید اور حقیقت شرک پڑھیے۔

يُمَنِّيهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ۝ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا ۝ ۱۲۱

اِن یدعون، یہاں پکارنے سے مراد وہ پکارنا ہے جو دعا، فریاد، استغاثہ، استعانت، استرحام وغیرہ کے قصد سے اس معنی میں ہو جس معنی میں معبود کو پکارا جاتا ہے۔

اناث، انثی کی جمع ہے۔ انثی، لغوی مفہوم میں تو نرم و نازک اور ڈھیلی ڈھالی چیز کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن معروف استعمال اس کا عورت کے لیے ہے۔ یہاں چونکہ مشرکین کے دیویوں دیوتاؤں کے ذکر کے سیاق میں ہے اس وجہ سے اس سے مراد دیویاں ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مشرکین کی دیو مالا میں خواہ وہ کسی قوم و ملک کے مشرکین ہوں دیویوں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ چین، ہندوستان، عرب، مصر اور بابل و نینوا وغیرہ کے مشرکانہ مذاہب کی جو تاریخ موجود ہے اس پر ایک سرسری نظر ڈال کر اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ یہ بات بھی خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی ہے کہ زندگی کی جو اصلی ضرورتیں ہیں وہ بیشتر انہی دیویوں سے متعلق سمجھی جاتی رہی ہیں۔ عرب جاہلیت میں بھی خدائی کے نظام پر بیشتر دیویوں ہی کا قبضہ تھا۔ لات، منات، عزیٰ وغیرہ دیویوں ہی کے نام ہیں۔ یہ، جیسا کہ سورہ نجم کی تفسیر میں واضح ہوگا، فرشتوں کے بت تھے جن کے متعلق مشرکین کا عقیدہ تھا کہ یہ خدا کی لاڈلی اور چہیتی بیٹیاں ہیں جن کی بات خدا کبھی نہیں ٹالتا اس وجہ سے ان کے واسطے سے جو کچھ مانگا جائے اگر یہ راضی ہوں تو وہ مل کے رہتا ہے۔ قرآن میں ان کے اس عقیدہ کا جگہ جگہ حوالہ ہے۔ مثلاً وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَٰنِ إِنَاثًا (۱۹- زخرف) (اور انھوں نے فرشتوں کو جو خدائے رحمان کے بندے ہیں دیویاں بنا ڈالا ہے)

پیچھے جبت و طاغوت کی بحث کے ضمن میں ہم یہ بات بھی واضح کر چکے ہیں کہ اہل کتاب نے بھی جب مشرک قوموں سے ان کو سابقہ پیش آیا تو ان کے بہت سے مشرکانہ طریقے اختیار کر لیے اور انہی کی طرح بہت سے دیوی دیوتا اپنے لیے بنا لیے جن کا ماتم ان کے انبیا نے کیا ہے اور یہ ماتم خود ان کے صحیفوں میں موجود ہے۔ نصاریٰ حضرت مریم کی نسبت جو عقیدہ رکھتے ہیں وہ بھی معلوم ہے۔

وَإِن يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَّرِيدًا۔ شیطان کے پکارنے کا ذکر اصل مرشد شرک کی حیثیت سے ہے اس لیے کہ وہی ہے جس نے آدم کو سجدہ کرنے کے معاملے میں خدا کے حکم کی رو در رو نافرمانی کی اور جب خدا نے اس کے اس تمرد و سرکشی پر اس کو لعنت کی تو اس نے دھمکی دی کہ میں

تیرے بندوں کو مختلف طریقوں سے توحید سے ہٹا کر شرک میں مبتلا کروں گا۔ اس وجہ سے شرک جہاں کہیں بھی اور جس شکل میں بھی پایا جاتا ہے اس کا امام درحقیقت شیطان ہی ہے اور اس اعتبار سے ہر وہ دعا اور التجا اور ہر وہ عبادت و اطاعت جو کسی غیر اللہ سے یا کسی غیر اللہ کے لیے کی جا رہی ہے وہ بالواسطہ شرک کے اس امام ہی سے اور اسی کے لیے ہوتی ہے۔

لَعَنَهُ اللَّهُ صفت بھی ہو سکتا ہے اس لیے کہ جس وقت شیطان نے اللہ کے بندوں کو شرک میں مبتلا کرنے کی دھمکی دی تھی اسی وقت اللہ تعالیٰ نے، جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے، اس پر لعنت بھی کر دی تھی اس وجہ سے وہ اس صفت کا دائمی موصوف ہے لیکن میں نے اس کو جملہ معترضہ کے مفہوم میں لیا ہے اور اسی اعتبار سے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اس میں بلاغت کا یہ پہلو ہے کہ گویا جوں ہی اس امام شرک کا نام آیا اللہ تعالیٰ نے بیچ اس کے عابدوں کے منہ پر اس پر لعنت کر دی۔ یہ اظہار نفرت کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ ہے۔

وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ الآية میں شیطان کی اس دھمکی کا حوالہ ہے جو اس نے اس وقت دی تھی جب اس نے آدم کو سجدہ کرنے کے معاملے میں کھلم کھلا خدا کے حکم کی نافرمانی کی اور خدا نے اس کو راندۂ درگاہ قرار دیا۔ اس دھمکی کا ذکر قرآن نے متعدد مقامات میں کیا ہے۔ مثلاً

قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ ۖ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ ۝ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَن تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ ۝ قَالَ أَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝ قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ۝ قَالَ فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ ثُمَّ لَآتِيَنَّهُم	خدا نے پوچھا کہ جب میں نے تجھے سجدے کا حکم دیا تو تجھے سجدے سے کس چیز نے روکا۔ شیطان نے جواب دیا کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے بنایا ہے۔ خدا نے فرمایا تو یہاں سے اتر۔ تجھے یہ حق نہیں ہے کہ تو اس میں اپنی بڑائی کا گھمنڈ کرے پس تو یہاں سے نکل، تو خوار ہونے والوں میں سے ہے۔ اس نے کہا مجھے لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن تک مہلت دے دے۔ خدا نے فرمایا تجھے مہلت دی گئی۔ شیطان نے کہا، چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے اس وجہ سے میں ان کی گھات میں تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں گا،

مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ ۖ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ۞ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُومًا مَدْحُورًا ۖ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ أَجْمَعِينَ (۱۷-۱۸۔ اعراف)	پھر میں ان کے آگے سے، ان کے پیچھے سے، ان کے دہنے سے، ان کے بائیں سے ان پر پھیرے ڈالوں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔ خدا نے فرمایا تو ذلیل و خوار ہو کر یہاں سے دور ہو، جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے تو میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔

شیطان کے اس مناظرے سے اس کے اس جوش و سرگرمی کا بھی پورا پورا اظہار ہو رہا ہے جو وہ بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے اپنے اندر رکھتا ہے اور یہ بات بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ اس کی تمام مساعیٔ ضلالت کا خاص ہدف توحید کا عقیدہ ہے۔ چنانچہ اس نے یہ جو کہا کہ میں تیری سیدھی راہ پر ان کی گھات میں بیٹھوں گا تو یہ سیدھی راہ وہی توحید کی راہ ہے جس کو قرآن نے صراطِ مستقیم سے تعبیر کیا ہے۔ اور یہ جو اس نے کہا کہ تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا، تو یہ بھی اسی بات کی تعبیر ہے کہ میں ان کو شرک میں مبتلا کروں گا اور یہ تیری حمد کے بجائے دوسروں کی حمد کے ترانے گائیں گے۔

’وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ‘ (میں ان کو جھوٹی آرزوؤں میں پھنساؤں گا) میں اس طرح کی جھوٹی آرزوؤں کی طرف اشارہ ہے جن میں بالعموم مشرک قومیں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً عربوں کا یہ عقیدہ کہ وہ جن دیویوں اور دیوتاؤں کو پوجتے ہیں وہ خدا سے ان کے لیے سفارش کرتے ہیں انہی کی سفارش سے ان کو دنیا کی نعمتیں بھی ملتی ہیں اور اگر آخرت کوئی چیز ہے تو وہ انہی کی سفارش سے آخرت میں بھی جنت کے حقدار ٹھہریں گے۔ اسی طرح یہود اس وہم میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ ابراہیم خلیل اللہ اور خدا کے برگزیدہ بندوں کی اولاد ہیں اس وجہ سے وہ خدا کے بیٹوں اور محبوبوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور جنت کے پشتینی حق دار ہیں، ان کے اعمال کچھ ہوں دوزخ کی آگ اول تو ان کو چھوئے گی نہیں اور اگر چھوئے گی تو محض عارضی طور پر۔ ان کی ان باطل آرزوؤں پر ہم بقرہ کی آیت ۸۰ اور ۱۱۱ کے تحت بحث کر چکے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس نصاریٰ کا یہ عقیدہ کہ خدا نے اپنے بیٹے کو ان کے تمام گناہوں کا کفارہ بنا دیا ہے، اب وہ

عمل و اطاعت کی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہیں۔

’فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ‘۔ بتک، کے معنی کاٹنے، چیرنے اور پھاڑنے کے ہیں۔ مشرک قوموں میں یہ مشترک روایت رہی ہے کہ وہ خاص خاص جانوروں کو ان کے کان چیر کر اپنے فرضی معبودوں کے نام پر بطور نذر چھوڑ دیتے رہے ہیں۔ یہ کان چیرنا اس مقصد کے لیے ہوتا تھا کہ دوسرے ان کو نذر سمجھ کر ان سے تعرض نہ کریں۔

’فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ‘ (پس وہ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بدلیں گے) اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بدلنے سے اصل مراد اس فطرت اللہ کو بدلنا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام خلائق کو پیدا کیا ہے۔ مثلاً توحید دینِ فطرت ہے لیکن شیطان اور اس کے ایجنٹوں نے اس کو شرک سے مسخ کیا۔ سورۂ روم میں شرک کی تردید کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۞ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۳۰-۳۱۔ روم)	پس تم یکسو ہو کر اپنا رخ دینِ حنیفی کی طرف کرو۔ یہی اللہ کی بنائی ہوئی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بدلنا جائز نہیں یہی سیدھا فطری دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اسی کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور اسی سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ ہو۔

اس آیت میں توحید کو ’دینِ فطرت‘ اور ’دینِ قیم‘ سے تعبیر فرمایا ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ اسی پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت اور ساخت کو بدلنا جائز نہیں۔ ہمارے نزدیک زیرِ بحث ٹکڑے میں بھی یہی مراد ہے ضمناً اس کے تحت وہ ساری چیزیں آ جائیں گی جو فطرت اللہ کی تبدیلی کے حکم میں ہیں۔ مثلاً عورتوں کا مرد بننا یا مردوں کا عورت بننا یا عورتوں اور مردوں کو ناقابلِ اولاد بنانا اور اس قبیل کی دوسری خرافات۔

’وَلَآمُرَنَّهُمْ‘ میں شیطان کے جس امر کا ذکر ہے اس کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عربی میں امر کا لفظ حکم دینے، مشورہ دینے اور سمجھانے، سب معنوں میں آتا ہے۔ شیطان ان

تمام طریقوں سے توحید کی راہ مارتا ہے۔ وہ اپنے لقائے شیطانی سے دلوں میں وسوسہ بھی ڈالتا ہے اور جنوں اور انسانوں میں سے جو لوگ اس کے ایجنٹ بن جاتے ہیں ان کے واسطے سے مشورے بھی دیتا ہے اور اگر اس کے ایجنٹ زور آور اور با اقتدار ہوتے ہیں تو ان کے ہاتھوں قانون بھی بنواتا ہے اور اس قانون کو نافذ بھی کراتا ہے۔

اجزا کی تشریح کے بعد اب ان آیات کے نظام اور ان کے مفہوم پر بحیثیت مجموعی بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

اوپر کی آیت میں شرک کے ناقابل مغفرت جرم ہونے کا ذکر ہوا تو لگے ہاتھوں شرک کے بودے پن اور اس کے حسب و نسب کا بھی ذکر فرما دیا تاکہ اس کا مکروہ چہرہ اچھی طرح بے نقاب ہو جائے۔

بودے پن کا ذکر دو پہلوؤں سے فرمایا۔ ایک تو یہ کہ شرک کا یہ سارا کارخانہ دیویوں کے بل بوتے پر قائم ہے، اول تو یہی پرلے سرے کی حماقت ہے کہ خدائے واحد کے سوا کسی اور کا سہارا انسان ڈھونڈھے، پھر حماقت در حماقت یہ کہ سہارا بھی فرضی عورتوں کا جن کی بے بسی و ناتوانی خود ضرب المثل ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کی تمام تر بنیاد شیطان کی پیدا کی ہوئی جھوٹی آرزوؤں اور اس کے پرفریب وعدوں پر ہے اور شیطان کے سارے وعدے بالکل بے حقیقت ہیں وہ جب حقیقت کھلے گی تو نظر آئے گا کہ نہ ابراہیم کا حسب نسب کچھ نافع ہے اور نہ لات و منات اور ان کی شفاعت کا کوئی وجود ہے بلکہ سارا معاملہ ایمان و عمل صالح پر منحصر ہے، جن کے پاس یہ متاع نہیں ہے ان کے لیے صرف جہنم ہے جس سے فرار کی کوئی راہ نہیں ہے۔

اس کے حسب و نسب کا بیان اس طرح فرمایا کہ اس کا موجد اور امام ابلیس لعین ہے جس نے جوشِ حسد میں پہلے ہی روز یہ دھمکی دی تھی کہ میں تیرے بندوں سے اپنا حصہ بٹا کر رہوں گا۔ میں ان کو گمراہ کروں گا، ان کو طرح طرح کی جھوٹی آرزوؤں میں مبتلا کروں گا، وہ میرے حکم سے بتوں کو نذرانے پیش کریں گے اور میرے القا سے فطرت اللہ کو مسخ کریں گے۔ فرمایا کہ جو لوگ اس شیطان لعین و متمرد کو اپنا مرجع اور کارساز بنائیں ان سے زیادہ بدبخت اور نامراد کون ہو سکتا ہے۔ فرمایا کہ شیطان ان کو وعدوں کے سبز باغ دکھا رہا ہے اور آرزوؤں کے جال ان کے آگے بچھا رہا ہے حالانکہ شیطان کے سارے وعدے محض فریب ہیں، نہ شفاعت ان کے کام آتی ہے، نہ بزرگوں سے نسبت۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے جس سے

کوئی مفر نہ ہوگا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا ۞ لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ ۗ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۞ وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا ۞ ۱۲۲ - ۱۲۴

یعنی شیطان کے وعدے اور اس کی پیدا کی ہوئی آرزوئیں تو محض جھوٹ اور فریب ہیں۔ البتہ اللہ کا وعدہ یہ ہے کہ جو ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کریں گے ان کو وہ جنت میں داخل کرے گا اور یہ وعدہ بالکل حق ہے اس لیے کہ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کے وعدے سے زیادہ سچا وعدہ کس کا ہو سکتا ہے۔ پھر فرمایا کہ نجات سے متعلق یہ جھوٹی آرزوئیں خواہ تمہاری ہوں (اشارہ منافقین کی طرف ہے) یا اہل کتاب کی ان میں سے کوئی بھی پوری ہونے والی نہیں ہے۔ جو بھی برائی کرے گا وہ اپنے کیے کی سزا بھگتے گا اور خدا کے سوا کوئی اس کا کارساز و مددگار نہ بن سکے گا۔ اسی طرح جو عمل صالح کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، اگر وہ مومن ہے تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ذرا بھی ان کے اجر میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

منافقین اور اہل کتاب دونوں کی آرزوؤں کا ایک ساتھ ذکر کر کے قرآن نے یہ واضح کر دیا کہ شرک، شفاعت اور خاندانی برگزیدگی کے بل پر جنت کے خواب دیکھنے والے سب ایک ہی جنت الحمقا کے بسنے والے اور ایک ہی دامِ فریب کے گرفتار ہیں اور ان سب کی نامرادی ایک ہی طرح کی ہے۔ آخرت کی بازی ان لوگوں کی ہے جو ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ جس کے پاس یہ دولت ہوگی، وہ فائز المرام ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اسرائیلی ہے یا اسمٰعیلی، عربی ہے یا عجمی، اس طرح کی کسی نسبت کی وجہ سے اس کے ساتھ کوئی کمی نہیں ہوگی۔

وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۗ وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا ۞ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ

وَمَا فِي الْأَرْضِ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطًا (۱۲۵ - ۱۲۶)

اب یہ اس ھدی اللہ اور سبیل المومنین کی سند اور اس کا درجہ و مرتبہ واضح فرمایا جس کی مخالفت کو شرک قرار دیا ہے اور جس سے یہ اوپر والی بحث پیدا ہوئی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی مخالفت اور اس سے انحراف کے کیا معنی؟ آخر اس کے دین سے بڑھ کر کس کا دین ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو یک قلم اللہ کے حوالہ کر دے اور ساتھ ساتھ وہ محسن بھی ہو یعنی اپنے رب کے ہر حکم کی تعمیل اس طرح کرے جس طرح اس کے کرنے کا حق ہے۔ یہی ملت ابراہیم ہے۔ جس نے یہ راہ اختیار کی اس نے ملتِ ابراہیم کی پیروی کی اور ابراہیمؑ کی ذات تو وہ ہے جس کو خدا نے اپنا دوست بنایا تو اس کی ملت سے بڑھ کر کس کی ملت ہو سکتی ہے۔ آخر میں اَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ کی علت واضح فرما دی کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ واحد ہی کا ہے اور وہ ہر چیز کا احاطہ بھی کیے ہوئے ہے تو اس کے سوا حق دار بھی کون ہے کہ اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دیا جائے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے خلیل اللہ ہونے کا ذکر تورات میں بھی بار بار ہوا ہے اور یہ چیز منجملہ ان چیزوں کے ہے جن کے سبب سے بنی اسرائیل اس آرزوئے باطل میں مبتلا ہوئے کہ چونکہ وہ اللہ کے دوست کے خاندان سے ہیں اس وجہ سے ان کی حیثیت اَبْنَآءُ اللّٰهِ اور اَحِبَّآءُ اللّٰهِ کی ہے۔ اور جب ان کی حیثیت یہ ہے تو دوزخ کی آگ کی کیا مجال ہے کہ وہ ان کو چھوئے۔ اس وہم کی تردید کے لیے یہاں یہ بھی واضح فرمایا کہ ابراہیمؑ کو اللہ نے اپنا جو دوست بنایا تو اس وجہ سے بنایا کہ انھوں نے ہر طرف سے کٹ کر اور بالکل یکسو ہو کر اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالہ کر دیا۔ ان کی ملت اسلام اور توحید کی ملت ہے اور وہ اس ملتِ توحید کے امام ہیں۔ اسی وجہ سے دینِ حق ان کا دین ہے جو اس امام توحید کی ملت کے پیرو ہیں نہ کہ ان کا جو امام شرک ابلیس کے پیرو ہیں۔

مشرقی پاکستان میں "میثاق" کی ایجنسیاں

۱۔ ظفر اینڈ کمپنی ——— نواب پور روڈ ڈھاکہ

۲۔ ایس ایم الیاس ——— ایم اے جناح روڈ چاٹگام

خان محمد ایم اے عربی

المنفلوطی (۲)

محاسن و معائب

ا۔ صوری محاسن منفلوطی نے زبان کی نفاست کو بہت حد تک کم کیا۔ سادہ اور سلیس اسلوب اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ تراکیب اور بندشوں کے استعمال میں منفلوطی یکتا نظر آتا ہے۔ جدید اور قریب کی تشبیہات اور استعاروں کا رنگ اس کے اسلوب کی دمک میں ایک گونہ اضافہ کر دیتا ہے۔ انہی خصائص کی وجہ سے اُسے امیر البیان کا خطاب دیا گیا۔ سعد زغلول کہا کرتا تھا "ان الاسلوب الذی کتاب بہ النظرات والعبرات احسن ما اجد ھا کثیرا فی کلام الکاتبین" [۱] اسی طرح جدید شعرائے عرب کے سرخیل اور ممتاز شاعر عباس محمود العقاد منفلوطی کے اس سہل اسلوب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے "فعال الی الاسلوب المرسل وسلم من تکلف السجع ولفق الصیغ والقوالب" [۲] اسی طرح قریباً ہر ادیب اور ناقد نے منفلوطی کے اسلوب نگارش کی دل کھول کر داد دی ہے۔ نقاد کو اس کے فن افسانہ نگاری پر تو اعتراضات ہو سکتے ہیں لیکن اس کے حسنِ اسلوب پر سب کو اتفاق ہے بلکہ اکثر ناقدین تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ منفلوطی کے ہاں صرف اسلوب بیان ہے۔ افسانہ سرے سے ہے ہی نہیں مثلاً الدکتور عمر فروخ، منفلوطی کے فن افسانہ نگاری میں عدم پختگی پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "الذی یستھوینا ھنا ایضا انما ھو عذوبة اللغة التی تمس عاطفتنا لا روعة القصة التی تنفذ الی قلبنا" مزید لکھتے ہیں "المنفلوطی منشی لا ادیب لیستھوینا اسلوبہ لا افکارہ ھو کاتب مترسل لا باحث مبتکر" [۳]

اسی طرح اے آربگ منفلوطی کے متعلق لکھتا ہے It was less the content of his essays, however, than the style in which they were writen that won for manfaluti his singular pre-eminence [۴]

اسی طرح دکتور عبدالعزیز عبدالمجید منفلوطی کی افسانہ نگاری میں کامیابی کے راز کا انکشاف کرتے ہوئے

---

[۱] محمد الکی الدین الادبیات العصریۃ ص ۔ [۲] عباس محمود العقاد "تراجمات فی الادب والفنون ص ۱۴۳"

[۳] الاکتور عمر فروخ "اربعۃ ادباء معاصرون" ص ۴۵ [۴] J.B.S.O.S., Vol. V, part ii, p. 318

رقمطراز ہیں:- IT IS THEREFORE THE MANNER OF PRESENTING THE SHORT STORIES MORE THAN THE MATTER THAT IS THE SECRET OF HIS SUCCESS[1] اسی طرح کم و بیش کوئی ناقد بھی منفلوطی کے حسن اسلوب کی ستائش کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اب ہم اس کے چند نمایاں صوری محاسن پر ناقدانہ سرسری نظر ڈالتے ہیں۔

(۱) **جدید تشبیہات و استعارات:-** فتح بغداد سے انیسویں صدی تک کا دور عربی ادب کا دور انحطاط کہلاتا ہے۔ اس دور میں اختراع بالکل ختم ہو گئی تھی۔ اس دور میں تکلف، اطناب، شرح نویسی اور تعلیق کے فرسودہ و بے کار مواد پر ساری صلاحیتیں صرف کی جاتی تھیں۔ گویا کھائے ہوئے نوالے کو دوبارہ چبانے کا نہایت گھٹیا کام اس دور میں ہوا۔ پورے عربی ادب کی طرح تشبیہات و استعارات کا استعمال عام تھا۔ جدید اور عمدہ تشبیہات کی قلت تھی۔ منفلوطی نے ادب عربی کو نئی نئی عمدہ تشبیہوں اور استعارات سے روشناس کرایا۔ منفلوطی کی تشبیہات و استعارات میں جدت کے علاوہ ایک اور خوبی یہ ہے کہ منفلوطی دور دور کی تشبیہوں کا استعمال نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے گرد و نواح اور قریب کی اشیاء سے تشبیہیں دیتا ہے۔ اس کی تشبیہات میں قرب خیال پایا جاتا ہے۔ منفلوطی کی تشبیہات کی اس خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عمر فروخ لکھتا ہے "فانه یتناول تشابیهه و اوصافه من متناول یده ولا یتکلف فی تطلبها ولا ایرادها"[2] منفلوطی کو عمدہ اور نئی نئی تشبیہات و استعارات استعمال کرنے میں مہارت حاصل ہے۔ بطرس بستانی لکھتا ہے "وله براعة فی اصطناع التشابیه المحسوسة و الکنایات و الاستعارات و للاشارات"[3] تشبیہات کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) عامة الناس سے مخاطب ہو کے انہیں بھڑکاتا ہے کہ تمہیں غمزدہ اور دکھیا لوگوں پر آنسو بہانے چاہئیں کیونکہ کائنات عالم کی ہر چیز ان پر گریہ کرتی ہے حتیٰ کہ آسمان و زمین بھی ان پر آنسو بہاتے ہیں۔ آسمان و زمین کے رونے کو اس طرح بیان کرتا ہے "ان السماء تبکی بدموع الغمام و یخفق قلبها بلمعان البرق و تصرخ بهدید الرعد و ان الارض تئن بحفیف الریح و تضج بامواج البحر"[4]

(۲) اسی طرح ایک جگہ اپنے دوست کی بدبختی اور خوش بختی کا موازنہ کرتا ہے اور موتیوں کی ایک لڑی سے خوبصورت تشبیہ دیتا ہے "کیف انتثر ذلک العقد اللؤلؤ المنظوم الذی کان حلیة بدیعة فی جید الدهر ثم استحال بعد انتثاره الی حصیات متبددات علی سطح الغبراء تطؤها

[1] THE MODERN ARABIC SHORT STORY: page 96-97

[2] اربعة ادباء معاصرون، الدکتور عمر فروخ ص ۔ [3] ادباء العرب ص ۲۰ ۔ [4] النظرات ج ۱ الرحمة

النعال وتتوسدها الحوافر وللاقدام"[1]

(۲) **کنایات:-** عمدہ کنایات کے استعمال میں بھی منفلوطی کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ ایک بہت بڑے مجمع کے وقت جو منظر پیش آ سکتا ہے اس کے متعلق یوں لکھتا ہے "فرأیت حوله مجتمعا حافلا تصطک فیه الاقدام بالاقدام وتمتزج فیه الانفاس بالانفاس ....."

(۳) **ڈرامائی اشارات:-** ڈرامائی اشارات پر بھی منفلوطی کو کافی دسترس حاصل ہے۔ ڈرامائی منظر بیان کرنے سے صورت حال جلد اور آسانی سے واضح ہو جاتی ہے۔ ایک غریب دوشیزہ کو سردی کی رات میں چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے دیکھ کر اس کی حالت یوں بیان کرتا ہے "وقد وضعت راسها بین رکبتیها اتقاء للبرد الذی کان یعبث بها عبث الکبائر بالعود و لیس فی یدیها ما تتقیه به الا اسمال تتراءی من تحتها مواقع جسمها العاری کانها السیاط تمزق اجسام المستعبدین فی عهود الاستبداد"

(۴) **ترکیبوں اور بندشوں کا اضافہ:-** ادبا کے دو طبقے نہایت افراط و تفریط کے مرتکب ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ زبان کی سالمیت کے لئے ضروری ہے کہ غیر ملکی اور دوسری زبانوں سے نئی نئی تراکیب اور انداز تعبیر عربی زبان میں ہرگز داخل نہ کئے جائیں ورنہ زبان اپنی سالمیت اور انفرادیت کھو بیٹھے گی۔ ایک گروہ عجمی زبانوں کی تراکیب اور بندشیں بغیر کسی پابندی اور ضرورت کے اور بغیر کسی ترکیب کے عربی زبان میں داخل کرنے کا حامی ہے۔ یہ دونوں گروہ خاطی الرائے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ ہے جو میانہ روی پر قائم ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر عربی زبان کی انفرادیت قائم رکھ کر عجمی بندشوں اور تراکیب کا استعمال کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ زبان اور وقت کے لحاظ سے ارتقائی منازل طے کرتی ہیں۔ منفلوطی اور محمد حسین اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا اتفاق ہے کہ زبان کی انفرادیت کو برقرار رکھ کر غیر ملکی تراکیب اور بندشیں استعمال کی سکتی ہیں اور وہ دونوں اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ منفلوطی اگر ایک طرف یورپی بندشوں اور تراکیب کو عربی زبان میں ڈھال لیتا ہے تو دوسری طرف وہ دیہاتی الفاظ مثلاً مذایب، نکتة وغیرہ استعمال کر لیتا ہے۔ منفلوطی کی تراکیب کی مثالیں "الفینة بعد الفینة، اخدع نفسی عن نفسی، بین جنبیها نار تضطرم، وجنین یضطرب فی لیلة من لیالی الشتاء، حالکة الجلباب حعیها"

(۵) **امثال اور اشعار کا استعمال:-** منفلوطی بات کی وضاحت کے لئے اپنے افسانوں میں بعض اوقات چھوٹی چھوٹی امثال بھی استعمال کرتا ہے اور اسی طرح کبھی کبھی اشعار سے بھی استشہاد کرتا ہے۔ کبھی پورے ابیات

[1] العبرات: البادیة۔

سے اور کبھی مصرعوں سے اوزان کی تحلیل کر کے نثر میں ہی مدغم کر دیتا ہے۔

(۶) **مترادف الفاظ**:۔ مترادفات کو کثرت سے استعمال کرنا منفلوطی نے جامعہ ازہر سے ورثہ میں پایا تھا وہ بعض اوقات ایک ہی معنی ادا کرنے والے جملے پے در پے لاتا ہے اس طرح عبارت میں موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً خلو بیزل یہ محاد یر وضعا لحتی حطاہ دعا دعا دالیہا شہ ھا ..... ۔

(۷) **منظر کشی**:۔ منفلوطی منظر کشی بڑی کامیابی سے کرتا ہے۔ خاص طور پر غم زدہ لوگوں کے احساسات و جذبات کو بیان کرنے کے لئے نپے تلے الفاظ اور شیرینی سے لبریز اور وسیع جملے استعمال کرتا ہے۔ غم و اندوہ اور حزن والم کے جذبات کی نگارش میں منفلوطی کو خصوصی مہارت حاصل ہے اس کی مثالیں تو اس کے تمام افسانوں میں بکثرت ملتی ہیں جن و یاس کے ساتھ قدرتی دلفریب مناظر کی تصویریں بھی کھینچتا ہے اور ان تصویروں میں اسی طرح رنگ بھر دیتا ہے۔ جس طرح قدرت نے ان اصل مناظر میں رنگ بھرے ہیں۔ "العبرات" کے افسانہ الیتیم کے تحت وہ یتیم کی موجودہ حالت اور وہ حالت جس میں پرورش پا کر وہ عنفوان شباب کو پہنچا تھا اس طرح پیش کرتا ہے اور مناظر کی تصویر کشی اس طریق سے کرتا ہے کہ وہ مناظر آنکھوں کے سامنے پھرتے نظر آتے ہیں۔

(۸) **منثور نظم**:۔ منفلوطی کے طرز نگارش کے محاسن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ منثور نظم کے ذریعے قاری کو تخیل کی بلندیوں کی سیر کراتا ہے جب افسانہ لکھتے لکھتے جذبات کی روانی کے دھارے بلند ہوتے ہیں تو وہ منثور نظم کا روپ دھار لیتے ہیں جس سے عجیب وجدانی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔

(۹) **قرآنی تراکیب اور بندشیں**:۔ منفلوطی قرآن حکیم کا حافظ اور اسلام کا شیدائی تھا۔ وہ آخر عمر تک کثرت سے قرآنی تراکیب استعمال کرتا ہوا نظر آتا ہے مثلاً ایک جگہ کہتا ہے والالوان من النبات متشبہات وغیر متشبہات وغیرہ۔

صوری معایب:۔ لیکن ان صوری محاسن کے ساتھ ساتھ کچھ صوری معایب بھی پائے جاتے ہیں مثلاً

(۱) الفاظ کی تکرار:۔ منفلوطی کی تصانیف مسلسل پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ الفاظ کی تکرار کرتا ہے مترادفات بار بار دہرانے کا عادی ہے اور اس کا سبب جامعہ ازہر کا جامد مُتفعل ادب تھا جو منفلوطی وہاں حاصل کرتا تھا۔ وہ مکمل احتراز نہ کر سکا۔

(۲) استعاروں اور تشبیہات کا تکرار:۔ منفلوطی کے افسانوں کو لگاتار پڑھنے سے آدمی استعارات و تشبیہات کا جا بجا تکرار پاتا ہے اور اکتاہٹ محسوس کرتا ہے۔

۱؎ بطرس بستانی۔ ادباء العرب صفحہ ۲۰۶

(۳) منفلوطی کے افسانوں میں کہیں کہیں ہم بازاری اور سوقیانہ الفاظ بھی پاتے ہیں بعض اوقات تو وہ بڑی ضعیف ترکیب باندھتا ہے۔ جیسے "فان شئنا من ذلک لم یکن" کبھی عامی اور دیہاتی زبان کے الفاظ استعمال کر جاتا ہے۔ جیسے "مطالیف فلاکتہ" بعض اوقات الفاظ کو ان کے اصل معنوں میں استعمال نہیں کرتا اور ایک معنی کے ادا کرنے کے لئے غلط لفظ استعمال کر جاتا ہے۔ جیسے متمدن کے لئے متمدین استعمال کیا اور اس کی دو وجوہ بیان کی جاتی ہیں ایک تو یہ کہ اسے مصری ثقافت کا مکمل علم نہ تھا نہ اس نے علوم شرقیہ میں مہارت حاصل کی تھی اور نہ ہی وہ مغربی علوم سے آشنا تھا۔ لغت سے عدم واقفیت بھی ایک وجہ بتائی جاتی ہے۔ لغت کا عالم بھی نہیں تھا اس لئے گھٹیا اور سوقیانہ الفاظ کا استعمال کر جاتا ہے۔

(۴) **مسجع عبارت**:۔ منفلوطی جب جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے، تو سجع نگاری پر اتر آتا ہے۔ یہ بھی افسانے کا ایک عیب شمار ہوتا ہے کیونکہ افسانہ سلاست و روانی کا تقاضا کرتا ہے لیکن منفلوطی کی سجع نگاری زیادہ تکلیف دہ نہیں ہے۔

ب۔ معنوی محاسن

منفلوطی کے افسانوں میں مندرجہ ذیل معنوی محاسن پائے جاتے ہیں۔

(۱) مقصدیت:۔ شعراء اور ادباء دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ایک گروہ ادب برائے ادب کا قائل ہے۔ ان کے نزدیک ادب محض تفریح طبع کا ایک ذریعہ ہونا چاہئے۔ اور قاری کو کبھی ملول و رنجیدہ نہیں کرنا چاہئے۔ دوسرا گروہ ادب برائے حیات کا قائل ہے ان کے نزدیک ادب کو محض تفریح طبع کا ایک ذریعہ بنانا ادب کی توہین ہے۔ ادب میں مقصدیت اور افادیت ہونی چاہئیں۔ منفلوطی بھی ادب برائے حیات کا بہت سختی کے ساتھ قائل ہے۔ اس کے دو ہی مقاصد ہیں۔ اسلامی اقدار کا پرچار اور معاشرے کی اصلاح کرنا۔ مغربی تہذیب و ثقافت سے لوگوں کو بیزار اور متنفر کرنا اور دین اسلام کی اشاعت کرنا۔ ان کے حصول کے لئے اس نے اکثر یہ طریقہ اپنایا کہ اپنے افسانوں کے کرداروں کو اسلامی اقدار کے خلاف زندگی بسر کرتے دکھاتا ہے۔ اور پھر اس زندگی کے گھناؤنے انجام کی خوفناک تصویر کشی کرتا ہے تاکہ قاری کے دل میں ایسے انجام کے خوف کی وجہ سے ایسی زندگی کے خلاف نفرت کے جذبات جنم لے لیں اور وہ کبھی بھولے سے بھی ایسی زندگی اپنانے کا قصد نہ کرے۔ یا اگر اس نے ایسی ہی زندگی اختیار کر رکھی ہو تو فوراً اسے خیر باد کہہ کے زندگی اسلامی ضابطہ حیات کے مطابق گذارنے لگ جائے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے یہ بڑا اچھا طریقہ ہے اور اس سلسلہ میں دکتور عمر فروخ سے اتفاق قطعاً ممکن نہیں جب وہ منفلوطی کو محض ناقد اور ناقم قرار دیتا ہے اور اسے مصلح ماننے سے کھلا انکار کرتا ہے وہ کہتا ہے۔ "وکان المنفلوطی منتقداً لا مصلحاً لقد انقب عن العیوب ولجاد تصویرھا د

بالغرق البراح معاولکنہ حیجا وال نوضیح اسس اصلاح اجتماعی[1]

گویا عمر فروخ کے نزدیک عیوب سے نقاب اٹھانا برائیوں کو دعوت دینا ہوا۔ منفلوطی کے افسانوں کے اصلاحی پہلو کی طرف ایسے ہی الفاظ سے بطرس بستانی نے اشارہ کیا ہے۔ اس نے سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا ہے:

"وانہ ان اراد الاصلاح الاجتماعی بھذہ المباحث، لقد تورط فی بعض الاغراض تورطا دام علیہ، بحیث اصبحت الغایۃ، لا تبرر الواسطۃ، فاکثارہ من ذکر الانتحار وسقوط الفتیات والفتیان، والخیانات الزوجیۃ، وتصویر المجتمع باقبح الصور، مضر بالاخلاق اکثر مما ھو مھذب لھا"

یہ درست ہے کہ منفلوطی اپنے افسانوں میں معاشرتی عیوب کو بے نقاب کرتا ہے اور یہ بھی بجا ہے کہ عیوب کو اگر عریاں کیا جائے تو قاری کو اس سے لذت حاصل ہوتی ہے اور وہ بجائے اس کے کہ ان کو عیوب سمجھ کر اس سے آئندہ بچنے کی کوشش کرے ان کا عملی تجربہ کرنے کا خواہش مند ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ دو صورتوں میں ممکن ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ معاشرتی خرابیوں کو واقعی بہت عریاں الفاظ میں بیان کیا جائے اور دوسری یہ کہ ان جرائم کے مرتکبین کا انجام گھناؤنا اور ہولناک نہ دکھایا جائے۔ اب اگر منفلوطی کے افسانوں پر نظر ڈالی جائے تو دوسری صورت کے باوجود کا تو احتمال بھی نہیں ہو سکتا۔ منفلوطی تو معمولی سی برائی کا انجام بھی ایسا دکھاتا ہے کہ دل دہل جاتا ہے۔ رہی پہلی صورت تو اکثر مقامات پر وہ ایسے ہی الفاظ استعمال کرتا ہے کہ جن کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں اور وہ مضر نہیں۔ لیکن بعض مقامات پر اس نے ذرا کھلے اور واضح الفاظ استعمال کئے ہیں جیسے "الزوجۃ الخائنۃ" اور "الملاعب الھزلیۃ" وغیرہ۔ لیکن دوسری صورت یعنی انجام کے گھناؤنے ہوتے ہوئے استلذاذ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا خواہ الفاظ کتنے ہی عریاں ہوں۔ اس لئے منفلوطی کی مصلح حیثیت سے انکار حقائق سے چشم پوشی کرنے کے مترادف ہے۔

(۲) حقیقت نگاری: حقیقت نگاری بھی منفلوطی کے افسانوں کی ایک خوبی ہے۔ افسانہ نگار کے لئے لازم ہے کہ اپنے ہی ماحول سے اپنے افسانوں کے کرداروں کو منظر عام پر لائے۔ تاکہ قاری کو ان کرداروں سے اجنبیت کا احساس تک نہ ہو۔ منفلوطی ہر وقت اپنے ماحول پر نظر رکھتا ہے۔ روز مرہ کے واقعات بھی اس کے افسانوں کا موضوع ہیں۔ وہ حقیقت کو ہی پیش کرتا ہے اور حقیقت نگاری کو ہی اپنے ادب کا سرچشمہ اور ذریعہ سمجھتا ہے۔ وہ بارہا مختلف مقالات میں اپنے اس خیال کا بھی اظہار کر چکا ہے۔

---

[1] اربعۃ ادباء معاصرون صفحہ ۶۹

(۳) اخلاص ادب: منفلوطی کا ادب اور اسلوب نگارش تکلفات و تصنعات سے مبرا ہے۔ اس نے اس چیز کا اظہار بھی کئی مقالات میں کیا ہے۔ منفلوطی مبالغہ سے کوسوں دور بھاگتا ہے وہ کہتا ہے کہ ادب کے سوتوں کا منبع دل ہے۔ یعنی وہ دل کے احساسات کے ساتھ اپنے ماحول پر نگاہ رکھتا ہے۔ اور انہی دو سرچشموں سے اپنے شجر ادب کی آبیاری کرتا ہے۔ اس کا حساس دل بہت جلد ماحول کا جائزہ لے لیتا ہے اور وہ بغیر کسی تکلف و تصنع کے لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔ وہ لوگوں کے فائدے کے لئے لکھتا ہے ان کو خوش کرنے کے لئے یا ان سے مدح ستائش کے کلمات سننے کے لئے نہیں لکھتا۔

مندرجہ بالا بحث سے معلوم ہوا کہ منفلوطی ادب میں مقصدیت کو بہت اہمیت دیتا ہے اور خود بھی مقصد کو ہر وقت پیش نظر رکھتا ہے۔ پھر اس مقصد کے حصول کے لئے حقیقت نگاری کو بھی ہاتھوں سے نہیں جانے دیتا۔ اور مقصدیت و حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ اس نے فنی تقاضوں کو بھی پورا کرنے کی حسب مقدور کوشش کی ہے۔ یہی اس کے فن کے صوری و معنوی محاسن ہیں۔

معنوی معائب منفلوطی کے افسانے معایب سے بھی پاک نہیں ہیں۔ اس کے افسانوں میں عموماً مندرجہ ذیل معایب پائے جاتے ہیں۔

(۱) فرضی کردار: افسانے میں اثر و جاذبیت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ افسانہ نگار اپنے افسانوں کے لئے ایسے کردار منتخب کرے کہ قاری کا ذہن اسے غیر حقیقی نہ سمجھے بلکہ وہ اسے حقیقت کی دنیا کا باشندہ خیال کرے۔ منفلوطی کے افسانے میں اس چیز کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے وہ اپنے کرداروں کا نام نہیں رکھتا۔ بلکہ فلاں کہہ کر گذر جاتا ہے یہ چیز واقع نگاری کے خلاف ہے۔ دوسرا وہ کردار کے مطابق زبان استعمال نہیں کرتا۔ حالانکہ چاہئے یہ کہ ہر کردار کی بات اسی کی زبان میں کی جائے۔ لیکن منفلوطی تیلی کے لئے بھی اپنی ہی زبان استعمال کرتا ہے۔ اس لئے اس کے کردار زندہ کردار نہیں ہوتے۔ محض خیالی اور بے جان ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایچ۔ اے۔ آر گِب منفلوطی کے کرداروں کے متعلق لکھتا ہے۔ "Absence of shading in his characters who are little than personifications of vistues or vices"[1]

محمود تیمور نے منفلوطی کے کرداروں کے متعلق بجا طور پر کہا ہے:

"ان اشخاص قصصہ اشباح لا ارواح"[2]

(۲) مبالغہ آمیزی و انتہا پسند رومانویت: افسانہ نگار کو چاہیئے کہ اپنے افسانوں میں ماحول کی صحیح صحیح عکاسی کی

---

[1] OP. CIT., P 321 [2] مقدمہ شیخ سید العبید

کرے۔ لیکن منفلوطی نے اپنے تئیں انتہا پسند رومانی دبستان کی جذباتی حزن پسندی کے حوالے کر دیا ہے[۱]۔ وہ اپنے ماحول اور واقعات وحقائق کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔ منفلوطی اپنے خاص مقصد کے لئے مبالغہ آمیزی کی حدود تک جا پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز عبدالمجید منفلوطی کی مبالغہ آمیزی کے متعلق لکھتے ہیں۔ "In his writings, essays and short stories, Al-Manfaluti is inclined to melodramatic exaggeration and romanatic pessimism" [۱]

مثلاً جب منفلوطی "الهاوية" میں شرابی کا نقشہ کھینچتا ہے تو نہایت مبالغہ سے کام لیتے ہوئے شرابی مجنون اور پاگل جیسے افعال کرواتا ہے۔ وہ اپنے بیوی بچوں کو مار دیتا ہے اور تباہی کا طوفان مچا دیتا ہے حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔

(۳) <u>کلبیت</u>:۔ کلبیت منفلوطی کی افسانہ نگاری کا نہایت قبیح عیب ہے۔ وہ معاشرہ میں بے انصافیاں، ظلم و جور اور بے مروتی و بددیانتی اور دیگر رذائل کو دیکھتا ہے۔ تو اپنے حساس اور نرم دل کے ہاتھوں نہایت سخت تکلیف و اضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور تنگ آکر کلبیت پر اتر آتا ہے۔ پھر دائیں بائیں ہر طرف اور ہر آدمی پر حملہ کرتا ہے۔ اس وقت پھر اس کی زد سے نہ کوئی ڈاکٹر یا طبیب بچ سکتا ہے اور نہ کوئی عالم اور وکیل۔ سب کو ہدف طعن و تشنیع بناتا ہے۔ مثلاً "الهاوية" میں اور الیتیم میں اس کے ڈاکٹروں کے سخت اور سنگدلانہ رویہ پر سخت نکتہ چینی کی ہے گو منفلوطی اپنی طبیعت سے مجبور ہے لیکن افسانہ ایسی لطیف صنعت کلبیت جیسی سنگین سخت چیز کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

(۴) <u>قنوطیت اور سادیت</u>:۔ یہ وہ خامیاں ہیں جنہوں نے منفلوطی کو وہ مقام حاصل نہیں ہونے دیا جو آج کے افسانہ نگاروں کو حاصل ہے۔ وہ طبعاً قنوطی واقع ہوا تھا۔ اس لئے وہ ہمیشہ انسان کے تاریک پہلوؤں کو ہی دیکھتا ہے۔ اس کے لئے دنیا وادی عبرت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسے دنیا میں رنج و غم اور مصائب و تکالیف کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کی نظر صرف ان مساکین و غرباء پر پڑتی ہے جو شدید سردی کے موسم میں چیتھڑوں میں ملبوس، پیٹ پر پتھر باندھ کر فٹ پاتھ پر ساری رات درد و الم سے کراہتے ٹھٹھر ٹھٹھر کر رات کے لمحات گن گن کر گزارتے ہیں۔ اسی لئے وہ رونے، نالہ و شیون، ولاشوں، گریہ وزاری اور آہ و بکا کی باتیں زیادہ کرتا ہے۔ وہ زندگی کی ان تلخیوں سے بچنے کے لئے تخیل کا سہارا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تخیلاتی

۱۔ THE MODERN ARABIC SHORT STORY PAGE 95

دنیا کو پسند کرتا ہوں۔ خوبصورت باغوں اور شہروں کا حال تو میں پڑھنا چاہتا ہوں، مگر انہیں اپنی آنکھ سے دیکھنا نہیں چاہتا کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ حقیقت جو عام طور پر کڑوی ہوتی ہے، مجھ سے میری وہ خوشی چھین لے جو مجھے تخیل نے دی ہے۔ منفلوطی کا دائرہ تخیل زیادہ تر حزن و یاس تک ہی محدود رہا۔ اس نے اپنے کرداروں سے زندگی کی رمق چھین لی۔ اس کے افسانے میں امید کی ہلکی سی کرن بھی بہت کم نظر آتی ہے۔ منفلوطی اپنے کرداروں کو زندگی سے انتہائی خودکشی کے ذریعے فرار حاصل کرنے کی راہ دکھاتا ہے۔ اس کے افسانوں میں اکثر خودکشی کے واقعات ہوتے رہتے ہیں جس سے قارئین یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ شاید اس زندگی کے مصائب و آلام سے نجات حاصل کرنے کا واحد طریقہ زندگی ہی سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔ اس طرح منفلوطی کے افسانے پیغام حیات دینے کے بجائے موت کی رغبت دلاتے ہیں۔ زندگی کے متعلق یہ انداز فکر معاشرے کے لئے نہایت مہلک ثابت ہو سکتا ہے اور ویسے سارے افسانوں کی فضاؤں پر مایوسیوں اور اداسیوں کے سیاہ بادلوں کو چھائے ہوئے دیکھ کر قاری حد درجہ ملول اور رنجیدہ ہو جاتا ہے۔

(۵) <u>خطابت</u>:۔ افسانوں میں منفلوطی کا اسلوب خطابی ہے اور خطابت افسانے کا ایک بہت بڑا عیب ہے۔ در اصل منفلوطی ادب برائے مقصد کا قائل تھا۔ افسانے لکھتے وقت یہی مقصدیت اور افادیت اس کے پیش نظر رہتی ہے۔ جب مقصد کے حصول کے پیچھے پڑ جاتا ہے تو افسانے کے فنی محاسن سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔ وہ قاری کو متاثر کرنے کے لئے خطابت اور وعظ شروع کر دیتا ہے اور اس وقت منفلوطی اور کسی منبر کے خطیب کے درمیان کچھ فرق نہیں رہتا۔ اس سے بھی زیادہ معیوب بات یہ ہے کہ خطابت بھی جب کرتا ہے تو جس کردار کی وساطت سے کرتا ہے اس کردار کی اہمیت کو مدنظر نہیں رکھتا۔ یہ نہیں دیکھتا کہ جس کردار سے اب خطیبانہ وعظ کرواتا ہے وہ اس کا اہل بھی ہے یا نہیں۔ بلکہ کردار کی جگہ خود ہی شروع ہو جاتا ہے۔ افسانہ نگار خطابت کا مرتکب اس وقت ہوتا ہے جب فکر کی گہرائی، قوت تحلیل اور وقت نظر کے نہ ہونے سے اپنے آپ میں قارئین کو متاثر کرنے کی صلاحیت نہیں پاتا۔ تب وہ خطابت کا رنگ اختیار کرتا ہے۔ ورنہ مقصدیت و افادیت فنی محاسن کی راہ میں قطعاً رکاوٹ نہیں بن سکتیں۔ اگر ادیب چابک دست ہو دونوں کو ساتھ ساتھ نبھایا جا سکتا ہے۔

(۶) <u>معانی کی تکرار</u>:۔ منفلوطی کے کچھ افسانے اگر متواتر پڑھے جائیں تو آدمی اکتا جاتا ہے۔ وہ معانی کا تکرار کثرت سے کرتا ہے۔ موضوع میں کوئی خاص تبدیلی نہیں کرتا۔ صرف الفاظ کے رد و بدل سے ایک نیا افسانہ تیار کر لیتا ہے۔ اس کا ہر قصہ غمزدہ و مایوس عشاق کا قصہ ہے یا آلام روزگار سے ستائے ہوئے کسی آفت رسیدہ کا قصہ۔ ہر افسانے کی ابتدا عذاب و بدبختی ہے اور اختتام یاس، ناامیدی، موت یا خودکشی ہے۔

اور معانی میں رنگارنگی کے بجائے یک رنگی ہونے کے دو سبب ہیں پہلا تو منفلوطی کی ثقافت کا ضعیف اور محدود ہونا۔ منفلوطی ایک ازہری سے زیادہ کچھ نہ تھا اس نے صرف چند قدیم عربی کتب ادب کا مطالعہ کیا تھا، یورپی زبانیں تو جانتا ہی نہ تھا۔ اور دوسرا یہ کہ وہ عربی ادب میں افسانہ نگاری کا آغاز ہی کر رہا تھا اور جب زبانوں میں افسانہ نے ارتقائی منازل طے کر لی تھیں ان سے آشنا نہ تھا اس لئے اس کے ہاں عناصر فن افسانہ نگاری بھی ضعیف نہیں۔ اس کے ہاں نہ وسعت خیالی پائی جاتی ہے نہ وقت نظر نہ جذبات و عواطف کے تجزیہ کی صلاحیت اور نہ قوت جاذبیت وغیرہ۔ اس لئے اس کے افسانوں میں تنوع نہ پیدا ہو سکا۔

یہ تھی منفلوطی کی افسانہ نگاری کے معایب و محاسن کی فہرست منفلوطی کے یہ معایب اس کی شہرت یا مرتبت میں کوئی کمی نہیں کر سکتے۔ منفلوطی کے یہ معایب زیادہ تر اس کے نظریہ مقصدیت و افادیت کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور پھر کسی ادیب یا شاعر کے کلام پر تنقید کرتے وقت اس کے دور اور ماحول کو بھی تو نظر میں رکھنا چاہئے۔ منفلوطی کا دور عربی افسانہ نگاری کی ولادت کا دور تھا۔ ولادت کے دور میں ہی حالت شباب دیکھنے کی تمنا کرنا حماقت ہے۔ ابھی منفلوطی عربی ادب کو افسانہ سے روشناس کر رہا تھا۔ یورپی زبانوں سے بھی واقف نہ تھا۔ اس لئے ان معایب کا پیدا ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ بلکہ ان صوری و معنوی محاسن کا اس دور میں پیدا ہو جانا ایک عجوبہ ہے۔ کسی فن کو فنی شرائط پر تو اس وقت پرکھا جاتا ہے جب وہ فن درجہ کمال کو پہنچ چکا ہو۔ اور کسی بھی فن کے اصول و شرائط کی پابندی ان پر لازم ہوتی ہے جو ان کی وضع ہونے کے بعد اس وادی میں قدم رکھتے ہیں اور جو ان کے وضع ہونے سے پہلے ہی رخصت ہو گئے ہوں۔ ان کو ان اصول پر پرکھنا عدل و انصاف کے منافی ہے۔ منفلوطی نے اپنے افسانوں میں گو ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض مقامات پر تو بالکل بھٹک گیا ہے۔ لیکن یہ انجام ہر اس راہی کا ہوتا ہے جو ایک نئے اور انجانے راستے پر چلتا ہے۔ منفلوطی کی یہی لغزشیں اور ٹھوکریں بعد میں آنے والوں کے لئے راہنما ثابت ہوئیں۔ اس وقت منفلوطی کسی شاعر کا یہ شعر پڑھتا ہوا نظر آتا ہے ۔

کیا کہو گے میرے اس فعل کو اے اہل جنوں
میرے گرنے سے اگر کوئی سنبھل جاتا ہے!

طاہر القادری

نظامِ تعلیم کی فکری اساس

اور اس کی تلاش

دسمبر ۶۴ء میں حکومت نے سپریم کورٹ کے جج جناب حمود الرحمٰن کی سرکردگی میں ایک کمیشن قائم کیا تھا۔ کمیشن اس نوعیت کا تھا کہ تعلیمی دنیا میں جو بے چینی ہے اور اسے جن مسائل کا سامنا ہے ان کی تحقیق کرے اور جو عوامل اور محرکات اس بگاڑ کے منظر و پس منظر میں کارفرما ہیں ان کی نشاندہی کر کے ایک رپورٹ میں عملی سفارشات پیش کرے۔ اس کمیشن کو طلبہ کے ایک گروپ نے ایک میمورنڈم پیش کیا تھا۔ جس میں اس امر کی فکر انگیز تفہیم کی گئی تھی کہ ہمارے نظام تعلیم کا اساسی اور اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ اس کی تشکیل نو اب تک نظریاتی بنیادوں پر نہیں کی گئی اور جب تک ہمارے منہاج تعلیم کو نظریاتی پہلو کے اعتبار سے تشنہ رکھا جائے گا اور محض جزوی تبدیلیوں پر ہی اکتفا رہے گا اس وقت تک اس کے نتیجہ میں جو رد عمل مرتب ہوتا رہے گا وہ یہی فکری و ذہنی انتشار، پریشانی اور اضطراب ہے۔ جس کے اظہار کی صورتیں چاہے کتنی متنوع ہی کیوں نہ ہوں۔

یوں تو اس بات میں حیرت کی کوئی وجہ نہیں کہ جب سے تہذیبی تسلسل رکا ہے اور اسلامی تہذیب اور نوارد تہذیب میں ٹکراؤ پیدا ہوا اور قدریں کچھ گڈمڈ سی ہونے لگیں اور اس طرح حفاظت اور مفاہمت کی دو رسی پیدا ہو گئی جس نے اگرچہ تمدن و عمران کی ساری بساط الٹ کے رکھ دی اور معاشرے کو فکری و عملی ہر دو طرح سے الجھا اور منتشر کر دیا۔ لیکن اس سارے المیے کا جو پہلو زیادہ نمایاں ہے، وہ اپنی تہذیب اور نظام معانی و قدر کے دائروں اور ان کی سرحدوں کی شناخت کا مسئلہ ہے۔ کارواں کے لٹ جانے کا ماتم تو خیر دور کی بات ہے یہاں قلب و دماغ کا کوئی گوشہ ایسا نظر نہیں آتا جہاں سے "احساس زیاں" کی چنگاری سلگنے کی خبر ہی مل جاتی۔

جتنی بھی تہذیبیں آج تک دنیا میں گزری ہیں ان کے ارتقاء اور نشوونما کے ہر مرحلے پر اُن کی ذہنی اور فکری قیادت ایک گروہ کے ہاتھوں رہی ہے۔ یہ گروہ مفکرین اور دانشوروں کا ہے، اس کا کام تہذیب و تمدن کی صورت گری ہے اور یہ اپنے تخلیقی اعمال اور کارناموں کے ذریعے سے اس کلچر کی انفرادیت بقاء اور استحکام

کا اہتمام بھی کرتا ہے، یہ ترک و انجذاب کے منفرد اور مختلف زاویوں کے ذریعے سے تہذیب کا ایسا آئیڈیل یا پیکر تراشتا ہے جو اگرچہ اپنے رنگوں کے تناسب کے لحاظ سے ہمہ پہلو ـــــ اور احساسِ جمال کا آئینہ دار تو ہوتا ہی ہے لیکن اس تراش کی تکنیک میں وہ جس انوکھے انداز کو پیشِ نظر رکھتا ہے وہ اس پیکر کا اُس تہذیب روایت اور اس کے فکری تناظر ـــــ سے رشتے کا پہلو ہے۔ جسے نظر انداز کرکے وہ اپنی کسی تصویر کو بھی مقصداً اور معنوی اعتبار سے مکمل نہ کر سکے گا چاہے اس نے ذہن رسائی از حد ممکن قوتوں کو صرف کیوں نہ کر دیا ہو۔ اور یہ فیصلہ اس قوم کے معتقدات و تصورات اور اقدارِ حیات کی کوکھ سے نکلے ـــــ "ضمیر" کا ہوتا ہے ـــــ کہ فن و فکر کا یہ شاہکار پیکر، اس قوم کی امنگوں، اجتماعی عقیدے اور اقدار کا عکاس کس حد تک ہے۔ قارئین کو اگرچہ اس پیکر و تشبیہ کا قضیہ کچھ نادرست اور دور از کار محسوس ہو رہا ہوگا لیکن دراصل ایک مفکر، مصوّر، شاعر سنگ تراش اور دانشور کے تعلق کا مطالعہ کسی بھی معاشرے میں اسی مسلک کو پیشِ نظر رکھ کے کیا جاتا ہے چہ جائیکہ اس کی تفہیم و تنقیح پاکستان جیسے ملک کی نظریاتی تہذیب میں مقصود ہو اور وہ بھی "تجدیدِ حیات" کے زمانے میں تو اس کی حیثیت اور بھی عمیق اور وسیع ہو جاتی ہے۔

تجدیدِ حیات کے اس مرحلے پر ضروری تھا کہ یہ گروہ (مفکر اور دانشور) پیہم ذہنی سعی و عمل، غیر منقطع تگ و تاز اور انتھک کوششوں کو کام میں لاکر اس قوم کے تصورات و اقدار کے پیکر کو حسن و خوبی سے منور کرتا، اس کے نظامِ فکر کے خط و خال اور دائروں کو صحیح طور پر متشخص کرتا تاکہ سوادِ اعظم اپنے مسلسل تہذیبی ارتقاء و عمل کے نتیجے میں پیدا شدہ ـــــ متعینہ مقصدی راستوں سے ہٹ کر گمنام سمتوں میں نکل کر اپنی قوتوں کو بے جا ضائع نہ کرے لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا، یہ گروہ اس قوم کے تہذیبی مستقبل کا مطالعہ اور جائزہ ایک حقیقت نگار کے مشاہدے کی سی گہرائی اور باریک بینی اور ایک شاعر کے سے شاعرانہ عدل اور ایک محقق کی سی واقعاتی چھان بین کے انداز میں نہ لے سکا۔

یوں تو راست انداز اور سنجیدہ فکر و نظر کے حامل افراد کا ملنا ہمارے اس قحط الرجال کے عہد میں دشوار ہی ہے لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ ایسے اصحابِ فکر[1] جن کی حیثیت علم و فکر کے حلقوں میں مسلّم ہے، وہ جو علمی اور فکری موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے اظہار کو "اخباریت" کے پیرایوں سے دور ہی رکھتے ہیں ـــــ بھی کبھی "زمانے کے تقاضوں" ایسے فرسودہ نعروں یا کسی اور نامعلوم مصلحت کا شکار ہو سکتے ہیں۔

اس بات کی تائید اور عکاسی کمشن کی رپورٹ کے اس حصّے کو پڑھنے سے بخوبی ہوتی ہے، جہاں تصورِ تعلیم

[1] (خصوصاً محمود الرحمٰن صاحب اور کمشن کے دوسرے ارکان)

کی نظریاتی اساس 'اسلام' زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ لکھتے ہیں: "مختلف علوم و فنون میں مسلمانوں کا جو حصہ رہا ہے اگر اسے بھی پڑھا دیا تو یہ بہت کافی ہے" صفحہ ۵۵ "طبیعیات، ڈاکٹری، انجینیئرنگ اور دوسرے سائنسی اور فنی مضامین کو اسلامی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کیا ہم یہ سفارش کریں کہ اُن علوم میں مسلمانوں کے زمانے کے بعد جو کچھ ترقی ہوئی ہے، اس سے ہم اپنے طلباء کو ناواقف رکھیں" صفحہ ۵۶ ۔

کتنی سطحیت آمیز ہے یہ فکر اور کتنا غیر منطقیانہ استدلال اور مطالعہ ہے یہ "اسلامی منہاجِ تعلیم" کا۔ اگر یہ اصحاب فکر و دانش اسلام کا تصور "اتنا اقل" (MINIMAL) نہ رکھتے ہوتے تو یقیناً ان کی رسائی اسلام کے منہاجِ تعلیم کے بارے میں اس قدر عامی اور غیر عقلی نہ ہوتی جسے ہر صاحبِ فکر و نظر مذکورہ سطور کے مطالعے سے بجا طور پر محسوس کر سکتا ہے بلکہ اس کے برعکس فاضل ارکان کے قلب و نظر اسلام کے کائنات اور انسان کے بارے میں پیش کردہ معروضی معیارات (OBJECTIVESTANDARD) سے روشن ہوتے، ان کے ذہن میں اُس کی مابعد الطبیعی، واقعاتی اور روحانی اپیل بسی ہوتی، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اُن کے حاصلات، عقل و فکر اور "اسلام" کی مطلوب سرحدوں سے مغایر بلکہ متصادم ہوتے۔ اسلام کے منہاجِ تعلیم کے بارے میں تو ایسی رائے تو "ومن یعبد اللہ علی حرف" (کنارے کھڑے ہو کر اطاعت کرنے کے مترادف ہے) معلوم نہیں جھکاؤ کس جانب کس وقت، مصلحتوں اور تقاضوں کے عنوان سے ہو جائے اس میں "ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا" ہے کے سے معنوی استحکام اور وجدانی احساس کی پرچھائیاں تو دور دور تک نظر نہیں آتیں۔

ایسا کوئی بھی تصور جس میں اس قسم کی رائے کا اظہار کیا جاتا ہے، دراصل اسلام کے اس اصل تصورِ حیات کی غمازی نہیں کرتا جس کا مفہوم محض یہ جانا نہیں جہاں زندگی کو (WATERTIGHT COMPARTMENTS) کے انداز میں نہیں دیکھا جاتا ہے، بلکہ اسے ایک ناقابلِ تقسیم وحدت کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ جس کے اصولوں کی کارفرمائی کی تحدید مجرد اخلاق تک ہی نہیں کر دی جاتی بلکہ ان کا تسلط حیاتِ انسانی کے تمام شعبوں پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

اس مسئلہ کے اختلاف اور تانے بانے کی نوعیت معلوم کرنے کے لئے ہمیں، تاریخی پس منظر میں جھانکنا پڑے گا۔ اور اس نظریۂ زندگی کا مطالعہ تجزیاتی طریق سے کرنا ہوگا جس سے کہ یہ طریقِ فکر مترتب ہوا، جہاں سے اس خیال اور آورش کو مناسب نشوونما اور ارتقاء کی مطلوبہ غذا ملی۔ یورپ کی کلچرل تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ وہاں کسی دور میں بھی کسی ایسے نظریے کا چلن قوتِ حیات کی حیثیت سے نہیں رہا جس میں روح اور مادہ کی ثنویت کو بطور "قدر" تسلیم نہ کیا گیا ہو، اور اس کے اسلوبِ حیات اور اندازِ زیست کی تشکیل دین و دنیا کے متضاد اور متقابل فکری عناصر سے نہ کی گئی ہو۔ اس کی عالمگیریت تو سائنس اور ٹیکنالوجی

کی روزافزوں ترقی کی وجہ سے ہے، جس سے کرۂ زمین کی طنابیں کھنچتی محسوس ہو رہی ہیں اور پورا گلوب ایک ہی برادری بن چکا ہے۔

ہمارے ہاں جو اس کا مطالعہ بالکل ہی منفرد انداز میں کیا جاتا ہے تو یہ بھی ہمارے مخصوص نظریاتی اور ثقافتی پس منظر کی وجہ سے ہے ورنہ سیکولر آئیڈیالوجی کو مکمل نظریئے کی حیثیت سے ماننے والی دوسری غیر یورپی، ایشیائی اور افریقی اقوام اور ممالک کے لئے اس نقطۂ نظر میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اور اگر وہ غلامی کے زمانے کے نظامِ تعلیم کو اپنی قومی امنگوں اور ضروریات سے ہم آہنگ نہیں سمجھتے تو اس کی وجوہ خالصتاً معاشی، سیاسی اور ثقافتی ہو سکتی ہیں، ایسا نہیں کہ وہ نظامِ تعلیم ان کے کسی مخصوص نظامِ معتقدات و اقدار کی روح کے منافی ہے۔

میں یہاں یورپ کی کلچرل تاریخ کے زیرِ بحث پہلو کو مؤرخ کی سی وقائع نگاری کے ساتھ مسلسل بیان نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس کے مذہبی نظریاتی، پس منظر، تصورات اور اجزائے ترکیبی کا کچھ اجمالی سا خاکہ سامنے لانے کی کوشش کروں گا۔

مسیحی یورپ کی کلچرل تاریخ کا فکری تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرزِ فکر نے جسے بجا طور پر ایک مفکر نے "تخلیقی لادینیت" کا نام دیا ہے، کی تخلیق اصل بانیٔ مسیحیت کو ماننے والوں کی وہ تعلیمات ہیں جن میں قیصر اور قادرِ مطلق کے حقوق کی تخصیص کی گئی ہے، جس سے اس نظریہ کے سوتے پھوٹتے نظر آتے ہیں کہ حیاتِ انسانی کے کون کون سے دائرے سیکولر یا دنیاوی (MUNDANE) ہیں اور کون سے روحانی یا الٰہی۔ عیسائیت میں اس دنیا اور "آخرت" کے تضاد اور مغائرت کا تصور موجود ہے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی ربط، اتصال اور رشتہ موجود نہیں، بلکہ اگلی دنیا کے لذائذ اور "نجات" کا سارا دار و مدار اس دنیا میں جیتے جی آب و گل سے مہجوری اور ترکِ تعلق ہے۔ اخلاقیات کے دائرے میں مادے اور روح کے اس مابعد الطبیعی امتیاز کی بنیادوں پر ہی اس دور کے اعمال و افکار کی ساخت اور ہیئتِ ترکیبی سمجھ میں آ سکتی ہے اور اسی کے نتیجے میں عیسائیوں میں جسم کی تعذیب، خواہشاتِ نفسی و انسانی کا استیصال، تجرّد، رہبانیت اور بیمارانہ انکارِ خویش (MORBID SELF ABNEGATION) ان کے مذہبی اصول و فرائض کا لازمی حصہ بن گئے۔ اس فکری تضاد کے نتیجے میں اس تصور کی تشکیل بھی ہوئی کہ مذہب اور سائنس دو مختلف وحدتیں ہیں اور آپس میں ان کا کوئی رشتہ نہیں۔ ایک کا تعلق (سائنسی وحدت) کائناتی اصولوں (COSMIC PRINCIPALS) سے ہے جبکہ دوسری (مذہبی وحدت) کا کلی طور پر آخرت سے ہے۔ اور مقصود و منتہا اسی کو حسن و اعزاز بخشتا ہے۔ اور اس طرح اس دوسری وحدت (الٰہیاتی) کے بارے میں یہ تصور عام ہو گیا کہ اس کا مجموعی مزاج معقولیت (RATIONALISM) اور تجربیت کے خلاف ہے، اور زندگی کے معاملات کے بارے میں اس کی منطق فکری سکون پیدا کرتی ہے۔ جبکہ اس کے برعکس سائنس

کی منطقی اور عقلی بنیادوں پر استوار ہے اور اس کا نظامِ فکری حیات و کائنات کے بارے میں عقلیت، تجربیت اور مشاہدے ایسے تخلیقی عمل سے جنم لیتا ہے۔ اس فکری ماحول میں ایک مسیحی کے لیے یہ بات کچھ فطری سی ہو گئی کہ وہ اپنی فکری اور ذہنی ساخت، روایت اور اذعانیت پسندانہ عقیدے (DOGMATIC CREED) کے نقطۂ نظر سے مجبور ہو جاتا کہ تصورِ خدا واقعی غیر عقلی اور مابعد الطبیعی فکر کا نتیجہ ہے اور الٰہیاتی تصورات کسی ایسے نظامِ تغیر و تجربہ کے تخلیقی امکانات کو بانجھ اور محبوس کر دیتے ہیں جو نئے عہد کی اقدار کی تخلیق و ارتقاء کے مصدر کی سی حیثیت رکھتا ہو۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس بارے میں اُن کا یہ اتفاق (کہ سائنس اور الٰہیات دو متضاد وحدتیں ہیں) اُن (مغرب) کے مخصوص تہذیبی اور فکری میلان اور اندازِ نظر کا منطقی نتیجہ تھا۔ کیونکہ جس بطن میں فرزندِ مغرب نے پرورش پائی، جس ماحول میں اُس نے سانسیں لیں، وہ کسی دور میں بھی کسی ایسے نظامِ فکر کی ——— تجربہ گاہ نہیں رہا۔ جو انہیں زندگی کے ایسے وحدت آسا نظامِ خیال کا احساس بخشتا جس میں اپنے اندر چھپی ہوئی کائنات میں کارفرما اصولوں میں کوئی گریز یا مغائرت کے عوامل نہ ہوتے بلکہ ان ہر دو میں اتصال، اتحاد اور رفاقت کا سا خیال انگیز امتزاج موجود ہوتا اور یہ خیال کیا جاتا کہ ان دونوں میں ایک ہی "قوت" کی ہمہ جاری و ساری ہے۔ یورپ کے اس انٹلکچول سیکولرازم کو یہ سمجھنا کہ اس کی نشو و نما اور ارتقاء محض سائنٹفک سپرٹ کے عقیدے کے اخذ و قبول سے ہی ہوا ہے کچھ درست معلوم نہیں ہوتا، بلکہ واقعہ یوں ہے کہ اس فکری عقیدے نے چرچ اور سٹیٹ کی قدیمی اور غیر معقول کشمکش سے بھی انسپریشن حاصل کیا۔ جہاں چرچ نے سائنسی فکر کے حامل نابغہ افراد کو زندہ جلا دینے کے حکم بھی جاری کئے اور ایک مدت تک ایسی علمی تحقیق و اکتشاف کرنے کے جرم میں "صالحین" نے مرتدین (سائنس دانوں) کے خون بہانے کو روا رکھا ——— اور اپنے اس عمل کو نجات اور رضائے الٰہی کا ذریعہ بنایا۔ یہی وہ تصورات کی دست گریبانیت اور آویزش تھی جس نے رفتہ رفتہ زندگی کے دوسرے عمرانی، ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی اداروں کو متاثر اور مجروح کیا ——— جن میں ابھی خدا پرستی کی روح ——— کسی نہ کسی صورت میں، کسی حد تک باقی تھی۔ اب زندگی کے مربوط شعبوں میں انتشارِ فکر اور بے راہ رَو آزاد خیالی نے اختلال پیدا کر دیا اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کی نئی اساس کی حیثیت سے سیکولر تصورات کو قبول کر لیا جانے لگا ...... اور مذہب اور سیاست کی تفریق نے ایک لحاظ سے ایک تاریخی اور ناگزیر حقیقت کا درجہ حاصل کر لیا۔

کچھ لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ سائنس کا مزاج اپنے تجربوں اور مشاہدوں کے اعتبار سے آفاقی ہے، اس لئے اس کے کردار کا مطالعہ ہر مذہب و ملت میں ایک ہی زاویۂ نگاہ سے کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک اس مسئلہ کے اس پہلو کا تعلق ہے کہ لیبارٹری میں اس کے آفاقی اصولوں سے انحراف ممکن نہیں اور اس کے مقدمات، استخراجات اور نتائج ——— نوعِ انسانی کا مشترکہ سرمایہ ہیں ——— کسی کو اس حقیقت سے انکار نہیں۔ اور اس سچائی

کو ماننے میں جذباتی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کو کوئی دخل نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اہلِ نظر جانتے ہیں کہ سائنٹیفک سرگرمیوں کے عملی سرچشموں (لیبارٹریاں) کو کسی صورت میں بھی عمرانی زندگی کے دوسرے شعبوں سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ سرگرمیاں براہِ راست یا بالواسطہ طور پر ہماری زندگی کے ہر ایک شعبے کو متاثر کرتی ہیں۔ اور ہمارے عمرانی افکار و تصورات کی تنظیم اور ساخت میں ایک مؤثر عامل کا کردار انجام دیتی ہیں۔ ہاں البتہ یہ درست ہے کہ سائنسی فکر اپنے ارتقا کے ابتدائی مراحل میں اتنی نتیجہ خیز فعلیت کی حامل نہ تھی جتنی کہ آج، جبکہ یہ شباب پر بھی ہے اور غالب بھی۔ ایسے میں اگر ہم تمدنی و ثقافتی مسائل و احوال کا ممکن حد تک راست انداز میں مطالعہ و تجزیہ کرنا چاہیں۔ تو یہ ممکن ہی نہ رہا کہ ہم سائنسی فکر کی فعلیت اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ عصری آتلاف (SYNTHESIS) کا انکار کرتے ہوئے، اس کا مطالعہ معروضی طریق (OBJECTIVE METHOD) سے کر سکیں۔

جب ہم سائنسی فکر کے کارناموں کی ناقدانہ قدر و قیمت متعین کرتے ہیں تو اس وقت ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اس امر کا جائزہ لیں کہ سائنسی فکر نے —— فکر و فلسفہ پر اثر ڈالنے اور نئی اقدار و تصورات اور رویوں کو جنم دینے کے علاوہ —— خود اس کے ایک "نظامِ فلسفہ" بننے کے عمرانی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوئے ——

جس طرح دوسرے علوم نظری و عملی سرچشموں سے عبارت ہیں اسی طرح سائنسی فکر بھی، یہاں نظری پہلو چیزوں کو سمجھنے کی آرزو اور تفحص کے عمل کا نام ہے اور یہ آرزو تخلیقی فکر و تخیل کے حامل عبقری (GENIUS) کو مادی کائنات میں کارفرما اصولوں کی دریافت اور نقاب کشائی کرنے کے لئے ہر آن اکساتی رہتی ہے اس کے برعکس عملی سرچشمہ وہ خواہش ہے جو پہلے سے متعین کئے ہوئے مقاصد کے حصول کے لئے ہمارے عمل کا رخ متعین کرتی ہے[1]

یعنی اس سرچشمے کا کام یہ ہے کہ نظری تخلیقی سرگرمیوں کے نتائج و حاصلات کا عملی انطباق۔ اور ان کی معنوی و قدری اہمیت کا تعین ہمارے موضوع کے نقطۂ نظر سے سائنسی فکر کا یہ پہلو خاصے وقیع مضمرات و موثرات کا حامل ہے۔

آج زندگی جن بھی پیچیدگیوں کا شکار ہے اور اسے جو بھی مسائل درپیش ہیں اور قدامت اور جدّت —— افراط و تفریط کے جتنے بھی نظام ہائے حیات آپس میں برسرِ پیکار نظر آ رہے ہیں، اگر ان کے نقشۂ افکار، مقصودات اور اسالیب کا مطالعہ کیا جائے تو تناظر (PERSPECTIVE) میں ہمیں سائنسی فکر کے اس پہلو کی روح

---

[1] تعلیم کے مقاصد۔ ص ۱۰۱ (وائٹ ہیڈ)

بڑی آسانی سے نظر آئے گی۔ ہمارے نزدیک اس میں بالذات طور پر خیر و صواب کی کوئی بات نہیں، ہم خود اس امر کے داعی ہیں کہ زندگی کی تصویر اپنے رنگوں کے تناسب میں کچھ طیف (SPECTRUM) کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس کا تصوری و جمالیاتی پہلو اس وقت تک تشنۂ تکمیل رہے گا، جب تک کہ اس کی ترتیب میں آدرش کے سے حسین و ناگزیر رنگ کو شامل نہ کیا جائے۔ آج کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے۔ کہ اس کے سیاسی، اقتصادی اور امن کے اقوامِ عالم سے تعلقات کرنے کے اعمال اس کے آدرش کا نتیجہ نہیں ہیں اور وہ علم کے ذریعے سے اپنے آئیڈیل سے رنگ یا مخصوص —— (COMPLEXION) کا اکتساب نہیں کرتا۔ اس لئے کہ علم کبھی بھی محض معلومات کے ترک و انجذاب کا نام نہیں رہا۔ بلکہ یہ ہمیشہ انسانی زندگی کی —— تعبیر و تہذیب اور اسے ایک جامع مانع انداز میں ایک نظامِ حیات عطا کرنے کا وسیلہ رہا ہے۔ (چاہے اس نظام کی اساس کچھ ہی کیوں نہ ہو) —— کسی خاص معروض (OBJECT) کی تشکیل میں علمی تحقیق اور اس کے بارے میں رویہ (ATTITUDE) ہر دو عوامل حصہ لیتے ہیں اور اسی صورت میں علم کو عضوی کل (ORGANIC WHOLE) کا مقام دیا جا سکتا ہے۔ معروضی اشیاء میں شامل (PROPERTIES) کا علم ایک داخلی حقیقت ہے، اور ان معروضی اشیاءؔ کے بارے میں ہمارا داخلی رویہ ہمارے شعور میں —— اس صورت میں مختلف اور مغائر انداز میں ابھرے گا۔ جبکہ ہمارے آدرش جدا جدا ہوں گے، اور خواہ یہ علم طبیعیات و ریاضی کا ہی کیوں نہ ہو۔ نازی جرمن بجا طور پر یہ یقین رکھتے تھے کہ ان کی سائنس اور علوم منہاجیات —— (METHODOLOGY) کے اعتبار سے دوسری دنیا کی سائنس سے الگ ہیں۔ اور آج روسی بھی اپنی اسی آگہی میں سچے ہیں کہ ان کی سائنس (بشمول ریاضی) سرمایہ دارانہ ممالک کی سائنس سے الگ ہیں اور اپنی مستقل بنیادوں پر استوار ہے۔

مختصر یہ کہ علم اور آدرش کا گہرا تعلق ہے، یہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں، علم میں آدرش کی عدم شمولیت تجربی نقطۂ نگاہ سے ایک افسوسناک حادثہ ہے، ہم علم کے حاصلات، معنویت اور ان کی ترقی کا تعین آدرش کی بخشی ہوئی فکر و بصیرت اور روشنی میں ہی کر سکتے ہیں۔ ورنہ اگر ہم تہذیبی اور ثقافتی ضعف اور تنزل —— اور ترقی کا ذکر کریں گے تو یہ سب اضافی باتیں معلوم ہوں گی، یہی آدرش ہی ہے جو ہمیں کائنات کے "تخلیقی اصل" کا شعور اور آگہی بخشتا ہے۔

سوئے اتفاق سے مغرب میں (عالمِ اسلام کے برعکس) جس تمدن کی روح اس کے آرٹ اور اجتماعیات سے منتقل دوسرے علوم میں جلوہ گر تھی، اس کا خمیر ہی دو مختلف الخیال تہذیبوں سے اٹھایا گیا تھا اس کی کلیت میں کسی ایسی فکری وحدت یا INTEGRATION کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جس میں زندگی کے یہ تمام چھوٹے بڑے ذرّے کا حصہ رہے ہوں، اس کی تہذیبی ترکیب۔ رومیؔ، یونانیؔ اور فلسطینیؔ تین بڑی تہذیبوں سے عبارت

ہے۔ جیسا کہ ولفرڈ کینٹ ویل سمتھ نے لکھا ہے کہ یورپ میں یہ دونوں (رومی یونانی اور فلسطینی) تاریخ میں ساتھ ساتھ چلتی نظر آتی ہیں، کبھی کبھار تصادم اور بے چین تناؤ کی کیفیت سے بھی دوچار ہوئیں لیکن ایسا نہ ہو سکا کہ شیر شکر ہو جاتیں۔

جس طرح دوسرے غیر سائنٹفک علوم اپنی مخصوص خصوصیت، رویے اور منطقی فکر کی بنا پر ایک انفرادیت رکھتے ہیں، اسی طرح سائنٹیفک علوم بھی اپنی تفصیل و اجمال میں مذکورہ خصوصیت کے آئینہ دار ہیں، ان کا خاصہ ہے کہ یہ اقدار کے بارے میں اپنی تجربی اپروچ کی وجہ سے ہر طرح فیصلوں خواہ وہ جمالیاتی، اخلاقی یا روحانی ہوں۔ نظرانداز کر دیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فکر کا ایک ایسا میدان خالی رہ جاتا ہے جو وسیع بھی ہے اور عمیق بھی، جس کا پُر کیا جانا — ایقان و تعقلیت کے نقطۂ نگاہ سے بڑا ہی ضروری ہے۔ راست فکر اور متوازن اہلِ دماغ (ITELLGENSIA) نے ہر دور میں اس کی وسعت کو تسلیم کیا ہے۔ یہ علم ماہیت وجود (ONTOLOGY) اور مابعد الطبعیات کا فطری میدان ہے۔ اس کے تفاعل کو ماننے والوں کے نزدیک زندگی کی توجیہہ محض سائنٹفک علوم کے ذریعہ ممکن نہیں، خواہ کتنی ہی ذہنی کاوش کیوں نہ کی جائے۔ اور ذہن کتنا ہی رسا کیوں نہ ہو۔

اس تہذیبی نظریاتی پس منظر نے افکار و تصورات کی جو میراث عصر حاضر کے مغرب کو منتقل کی ہے، اس میں ردو قبول کی کوئی مثبت روایت موجود نہیں، اس کے قلب و دماغ، تعصب اور عدم رواداری (INTOLRENCE) سے سرشار ہیں۔ اس کا واضح ادراک انٹلکچول سیکولرازم کے پرستاروں کے مذہب، اخلاق، جمالیات اور حقیقتِ اولیٰ کے بارے میں مشہور زمانہ تصورات (جو دراصل تعصبات ہیں) کے سرسری مطالعہ سے ہو سکتا ہے، ان کا عقیدہ کائنات کے خالق کے وجود کے بارے میں انتہا درجہ غایت پسندانہ اور غیر عقلی ہے، اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ فطرت کا عمیق مطالعہ اور مشاہدہ اگر انہیں خالق کے وجود کے اعتراف کی منزل تک لے بھی جائے تو بھی ان کے لئے یہ مشکل آن پڑتی ہے کہ وہ خدا پرستی جیسے رجعت پسندانہ (بقول ان کے) عقیدے کے تلخ ذائقہ کو حلق کا قوں کس طرح برداشت کریں۔ یہ مرحلہ ان کے لئے بڑی کٹھن اور صبر آزما ہوتا ہے جبکہ ایک طرف انسانی فطرت کے تمام عقلی اور وجدانی داعیات (PROMPTINGS) ان سے اپنا فطری حق مانگتے ہیں دوسری طرف حقیقتِ اولیٰ یا اللہ کی ہستی کی نفی کرنے سے خیال و فکر کے دائرے میں پیدا ہونے والا خلا بُری طرح محسوس ہوتا ہے۔

اگر اس معاملہ پر ذرا گہری نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات خود بخود ابھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ مادیّین اور سائنسیت کے حامیوں نے نظامِ حیات و کائنات کی تحقیق و تجسس کیلئے جس رہنما اصول (تجربیت) کو اپنایا ہے وہ حقائق اور حقیقتِ کبریٰ (جو فطرت کے ظاہری (EXOTERIC) چلن کے پیچھے جھانک رہی ہے) کی صیانت اور عرفان میں کتنی بڑی کم نظری کا شکار ہے جب یہ بات عقلی اعتبار سے زیادہ درست ہے کہ سائنسی فکر کے میدان کا یہ رہنما اصول ہمارے حسی تجربہ حیات کی تشکیل کرتا ہے، وہ نظر، آواز، ذائقہ، بو، لمس اور دیگر ابتدائی احساسات سے براہِ راست ذہن کا انکشاف ہے یہ اسکی متعین سرحدیں ہیں جنکے باہر اسکی بے دقعتی اور بے بسی ایک نظری سطری حقیقت کا درجہ رکھتی ہے۔

یوسف سلیم چشتی

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ
کرنے کے کام

یہ پروفیسر صاحب کے اس خط کا بقیہ ہے جو موصوف نے راقم الحروف کے ان خیالات کی تائید کے لئے تحریر فرمایا تھا۔ جو "میثاق" کے جون ۱۹۶۷ء کے "تذکرہ و تبصرہ" میں پیش کئے گئے تھے۔ اس خط کا پہلا حصہ "فکرِ مغرب کی اساس اور اس کا تاریخی پس منظر" کے عنوان سے گذشتہ ماہ شائع ہو چکا ہے۔ —————— (اسرار احمد)

ص ۵۱ پر آپ نے لکھا ہے کہ "اس قسم کی کوشش کا مظہرِ اتم برِ صغیر میں دار العلوم دیوبند تھا جو کہنے کو تو صرف ایک درسگاہ تھا لیکن واقعۃً اس کی حیثیت ایک عظیم تحریک سے کسی طرح کم نہ تھی۔" نیز یہ کہ "یہ امر واقعی ہے کہ ان (سر سید) کی ان کوششوں سے دین و مذہب کی جان نکل گئی اور مادہ پرستانہ ذہنیت کے تحت مذہب کا ایک لامذہبی ایڈیشن تیار ہوا۔" میں آپ کے اخذ کردہ ان نتائج سے بالکل متفق ہوں۔ سر سید نے مذہب کے درخت میں مغربی فلسفے کا جو پیوند لگایا ہے اس کے اثمار تلخ سے پاکستانی مسلمانوں کے کام و دہن بقدرِ ذوق خوب لذت اندوز ہو رہے ہیں۔ "دقیانوسی ٹائپ" کے مسلمان ابھی سے اس تلخی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں انہیں کون بتائے کہ ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا

ص ۸ پر آپ نے لکھا ہے کہ "ان تحریکوں کا مطالعۂ اسلام اسی مغربی مادہ پرستانہ نقطۂ نظر پر مبنی ہے۔ جس میں روح پر مادے کو اور حیاتِ اخروی پر حیاتِ دنیوی کو فوقیت حاصل ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ تعالیٰ کا اقرار تو موجود ہے لیکن ایمان باللہ کی وہ کیفیت کہ انفس اور آفاق میں تنہا وہی فاعلِ مطلق، موثرِ حقیقی اور مسبب الاسباب نظر آنے لگے، بالکل مفقود ہے ۔ ۔ ۔ رسالت کا اقرار تو موجود ہے لیکن محبتِ رسول کا نام ہو جو عشق

میں آپ سے بالکل متفق ہوں اور آپ کو اس حقائق رسی ژرف نگاہی اور معرفت نگاری پر داد دیتا ہوں۔ یہی بات یہی ہے کہ جب تک ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کو فاعلِ حقیقی اور مؤثرِ حقیقی نہ سمجھے وہ قرآنی توحید کے مقام پر فائز نہیں ہو سکتا۔ اسلامی تصوف، جسے جاہل صوفیوں نے بدنام کر دیا، در اصل توحید ہی کو دل و دماغ میں جاگزین کرنے اور اسے زندگی میں ایک عاملِ مؤثر بنانے اور اس کے تقاضوں پر عمل کے لئے آمادہ کرنے کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ[1] اپنی تصنیف فتوح الغیب کے تیسرے مقالے میں فرماتے ہیں کہ "اے بیٹے اِسبات کو حرزِ جاں بنالے کہ لا فاعل فی الحقیقت ولا مؤثر فی الحقیقت الا اللہ" واحسرتا کہ آج شیخ موصوفؒ کے نام پر گیارہویں کی نیاز کرنے والے تو لاکھوں ہیں مگر ان کی تعلیم پر عمل کرنے والا ایک بھی نظر نہیں آتا۔ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ جس بزرگ نے پچاس برس تک مسلمانوں کو یہ تلقین کی ہو کہ اللہ کے سوا کوئی دستگیر نہیں، کوئی مشکل کشا نہیں، کوئی حاجت روا نہیں، آج اس کے نام لیوا خود اسی کو دستگیر اور مشکل کشا سمجھتے ہیں اور اللہ کے بجائے اسی کو پکارتے ہیں۔

صہ پر آپ نے لکھا ہے کہ "ضرورت اس امر کی ہے کہ اُمت میں تجدیدِ ایمان کی ایک عظیم تحریک برپا ہو تاکہ ایمان نرے اقرار اور محض قال سے بڑھ کر 'حال' کی صورت اختیار کرے۔"

میں اس باب میں آپ سے بکلی متفق ہوں۔ اقبال نے اسی بات کو یوں ظاہر کیا ہے بالفاظ دگر انہوں نے بھی یہی علاج تجویز کیا ہے:۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

صحابہ کرام رضؓ کی زندگیوں میں بھی یہی انقلاب نظر آتا ہے کہ عقیدۂ توحید ان کا حال بن گیا تھا اسی انقلاب کا یہ نتیجہ تھا کہ "انہیں یہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی اور خیالی نظر آتی تھی لیکن ذاتِ خداوندی ایک زندہ جاوید حقیقت معلوم ہوتی تھی" وہ جس طرف کو منہ کرتے تھے انہیں اللہ ہی نظر آتا تھا اور وہ ہر

---

[1] شیخ موصوف ۴۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ بیس سال کی عمر میں دینی علوم سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد بیس سال تک اپنے مرشد کے زیر تربیت رہ کر تزکیۂ نفس کرتے رہے۔ چالیس سال کی عمر میں مرشد کے حکم سے تلقین و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور پچاس سال تک مسلمانوں کو توحید کا درس دیتے رہے اور طالبانِ حق کی رہنمائی کرتے رہے۔ ۵۶۱ھ میں بغداد میں وفات پائی ؎

رحمتِ ایزدی بر روحش باد!

واقعے میں اللہ ہی کو کارفرما دیکھتے تھے۔ اکبر الٰہ آبادی نے ذیل کے شعر میں یہی اندازِ نگاہ پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔

ارشاد ہے کہ شرک نہ کر اور نماز پڑھ
مطلب یہ ہے کسی کو نہ دیکھ اور ہمیں کو دیکھ

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "ایمان بالغیب کے لئے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی یہ تبدیلی لازمی ہے کہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی و خیالی نظر آئے۔ لیکن ذاتِ خداوندی ایک زندۂ جاوید حقیقت معلوم ہو . . . . حیاتِ دنیوی فانی ہی نہیں بالکل غیر حقیقی اور بے وقعت معلوم ہو اور حیاتِ اخروی حقیقی اور واقعی نظر آنے لگے جب تک اُمّت کے ایک قابلِ ذکر حصّے میں نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی رونما نہ ہو احیائے اسلام کی آرزو ہرگز ہرگز شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے گی۔" میں آپ کی اس بات سے بکلی اتفاق کرتا ہوں بلکہ میری دلی آرزو یہ ہے کہ اللہ آپ کو توفیق دے کہ آپ اس صداقتِ عظمیٰ کو پاکستان ہی نہیں تمام دنیائے اسلام میں شائع کر سکیں اور ہر مسلمان تک پہنچا سکیں۔ میں پچاس برس کے غور و فکر کے بعد جس نتیجے پر پہنچا اللہ نے آپ کو دس پندرہ سال کے غور و فکر کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا دیا اور مزید کرم یہ کیا کہ اسے پیش کرنے کی سعادت بھی آپ کو عطا فرمائی۔

بیسویں صدی میں مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لئے جو تحریکیں ہندوستان اور دوسرے اسلامی ملکوں میں برپا ہوئیں وہ سب میری نگاہوں کے سامنے ہیں اور میں نے اپنی آنکھوں سے ان تحریکوں کو ناکام ہوتے دیکھا ہے۔ سبب اس ناکامی کا وہی ہے جو آپ نے بیان کیا ہے کہ جن لوگوں نے یہ تحریکیں برپا کیں ان میں بنیادی نقص یہ تھا کہ اللہ کے ساتھ ان کا تعلق محض قال تک محدود تھا بالفاظِ دگر وہ اسلام کا نام تو لیتے تھے مگر اس کی روح سے بیگانہ تھے۔ اسلام کی روح، جیسا کہ میں سمجھا ہوں محض ارکانِ اسلام کی رسمی پابندی نہیں ہے بلکہ دل کی آنکھوں سے اللہ عزّوجل کا مشاہدہ یا اُس ذاتِ پاک کے ساتھ ایسا شدید قلبی رابطہ ہے جو مسلمان کو اس مقام پر پہنچا دے جہاں پہنچ کر ہر وقت اللہ ہی پیشِ نظر رہتا ہے، غیر اللہ کی ہستی کالعدم ہو جاتی ہے۔

پھر آپ نے لکھا ہے "عوام کے قلوب میں ایمان کی تخم ریزی اور آبیاری کا مؤثر ترین ذریعہ ایسے اصحابِ علم و عمل کی صحبت ہے جن کے قلوب اور اذہان معرفتِ ربّانی سے منور ہوں اور سینے، کبر و حسد، بغض و بیر سے پاک ہوں اور زندگیاں حرص و طمع اور حُبِّ دنیا سے خالی ہوں۔"

میں اس معاملے میں بھی آپ سے بکلی متفق ہوں، از راہِ تفاخر نہیں بلکہ بطورِ اظہارِ حقیقت یہ بات

لکھ رہا ہوں کہ میں نے پچاس سال سے زیادہ عرصہ منطق، فلسفہ، الٰہیات اور علم کلام کے مطالعے میں ضائع کیا لیکن خدا گواہ ہے کہ نہ تو ان علوم وفنون سے اللہ کے ساتھ تعلق پیدا ہوا اور نہ کتابوں سے کبر وحسد، بغض وپندار اور حرص وطمع کا ازالہ ہوا۔ ان امراض خبیثہ کا ازالہ تو کیا ہوتا، الٹا میرا دماغ شکوک وشبہات کی جولانگاہ بن گیا اور اگر اس عالم پیری میں (سن ولادت ۱۳۱۳ھ ہے) توفیق ایزدی تصوف کے نخلستان میں نہ پہنچا دیتی تو آج تشکیک کے ریگستان میں العطش العطش پکارتا ہوتا۔ شکر ہے کہ وفات سے پہلے یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی کہ

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا (اکبر)

پیچ کہا ہے شیخ سعدیؒ نے:۔

جز یاد دوست ہر چہ کنی عمر ضائع است — جز حرف عشق ہر چہ بخوانی بطالت است
سعدی بشوئے نقش دوئی را ز لوح دل — علمے کہ راہ حق نہ نماید، جہالت است

نیز سچ کہا ہے مرشد رومیؒ نے:۔

علم چہ بود؟ آنکہ رہ بنمایدت — زنگِ گمراہی ز دل بزدایدت
علم نبود غیرِ علمِ عاشقی — مابقی تلبیسِ ابلیسِ شقی

یہ صحبت ہی کا تو ثمرہ تھا کہ ابن ابی قحافہ، صدیق اکبرؓ کے مقام پر فائز ہو گئے اور یہ صحبت ہی کا تو کرشمہ تھا کہ ابن خطاب کو فاروق اعظمؓ کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔ رضی اللہ عنہما۔
اسی لئے اقبال نے یہ کہا:۔

صحبت از علم کتابی خوشتر است
صحبت مردانِ حر، آدم گر است
دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم وحکمت از کتب، دیں از نظر

صہ ۱۳ پر آپ نے لکھا ہے کہ وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک زبردست علمی تحریک اٹھے جو تعلیم یافتہ طبقات اور ذہین افراد میں انقلاب برپا کر دے یعنی انہیں خدا پرستی کی دولت سے مالا مال کر دے۔

اس کیلئے سب سے پہلے ذہین نوجوانوں کو تلاش کرنا ہوگا۔ ان نوجوانوں کو
(۱) فکرِ انسانی کا جائزہ لینا ہوگا (از ابتدا تا عصر حاضر) اور اس کے ساتھ ساتھ
(ب) قرآن حکیم کا عمیق مطالعہ کرنا ہوگا تاکہ:۔
(ج) فلسفۂ مغرب کے ابطال اور تہذیب مغرب کے استیصال کا کٹھن کام ہو سکے — اور
(د) جدید علم الکلام کی تاسیس — اور
(ہ) قانون اسلام کی ہدایت کی وضاحت کی جا سکے

— اس تحریک کے لئے فوری طور پر دو چیزیں لازمی ہیں:۔
(۱) ادارہ عمومی دعوت وتبلیغ کا قیام (۲) قرآن اکیڈمی کا قیام

میں آپ کی ان تجاویز سے بکلی متفق ہوں لیکن اس سلسلے میں دو باتیں عرض کرنی چاہتا ہوں اولاً یہ کہ ان دونوں چیزوں کے قیام کیلئے ہم خیال افراد کی ایک جماعت بنائی جائے جو سب سے پہلے ایک رسالے اور ٹریکٹوں کے ذریعے سے اس تجویز کی کل پاکستان سطح پر اشاعت کرے اور متفق اصحاب کو جماعت میں شامل کرے۔

ثانیاً اس مجوزہ جماعت کی تشکیل کا کام ان اصحاب سے شروع کیا جائے جو گذشتہ پندرہ سال میں ان جماعتوں سے الگ ہوئے ہیں جو احیائے اسلام کا مقصد لے کر اٹھی تھیں یہ لوگ وہ ہیں جو اصولاً آپ سے متفق ہیں اور اس کام کو آگے بڑھانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

میثاق کے ذریعے سے ان سب افراد کو "جمعیت دعوت وتبلیغ اسلام" میں شامل کر لیجئے پھر جب ایک مرکز (NUCLEUS) بن جائیگا تو سعید ارواح خود بخود اس سے وابستہ ہوتی چلی جائیں گی۔

میں اس دعا پر اس خط کو ختم کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو عصر حاضر میں دعوت وتبلیغ اسلام کی توفیق ارزانی فرمائے اور یہ حقیقت آپ پر واضح کر دے کہ مقصد حیات استرضاء باری تعالیٰ ہے نہ کہ حصولِ حکومتِ ارضی۔ حکومت یا خلافت، ایمان وعمل صالح کا ثمرہ ہے نہ کہ مقصود بالذات شئی۔

اور آپ سے استدعا ہے کہ آپ اس ننگِ خلائق کے خاتمہ بالخیر کی دعا فرمائیں۔

وقتِ طلوع دیکھا، وقتِ غروب دیکھا — اب فکر آخرت ہے، دنیا کو خوب دیکھا (اکبر)

والسلام خیر الختام
مجمع عیوب وزشتی یوسف سلیم چشتی

ابصار احمد ایم اے
جامعہ ریڈنگ انگلینڈ

برید فرنگ

"آپ نے یہاں کی روزمرہ زندگی کے بارے میں تفصیلاً پوچھا ہے لیکن یہ واضح نہیں کیا کہ وہ مجھ سے متعلق ہو یا یہاں کی عام سوسائٹی سے۔ بہرحال اجمالاً مندرجہ ذیل سطور میں کچھ قلمبند کرتا ہوں۔

میرا واسطہ زیادہ تر چونکہ طلباء سے ہے اس لئے میرا مشاہدہ زیادہ تر انہی تک محدود ہے۔ البتہ بس، گاڑی کے سفر، بازار کی چہل قدمی اور شاپنگ اور اسی طرح کے دوسرے کاموں میں عام لوگوں کا رویہ اور اخلاق بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ یہاں کے لوگ عام لین دین اور کاروبار میں دیانتدار ہیں۔ بازار اور گلیوں میں لکڑی کے بوتھ میں اخبار پڑے رہتے ہیں۔ لوگ بکس میں پیسے ڈال کر ایک اخبار اٹھا لیتے ہیں۔ کوئی نگہداشت کرنے والا نہیں ہوتا۔ دکانوں میں بل کی ادائیگی، بسوں میں سفر، غرضیکہ ہر جگہ لوگ لائنوں میں اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔ بڑے بڑے سٹوروں میں مختلف اشیاء آپ خود اٹھاتے ہیں اور کاؤنٹر پر قیمت ادا کر دیتے ہیں۔ مشینوں کی مدد سے آپ کی لمبی چوڑی خریداری کا حساب چشم زدن میں ہو جاتا ہے۔ دکان میں گھومنے اور اشیاء اٹھانے کے لئے لوہے کی ٹوکری یا پہیوں والی گاڑی آپ کو دی جاتی ہے جس میں آپ اپنے بریف کیس یا چھتری کے علاوہ ایک دو بچوں کو بٹھا کر ساتھ دکان میں گھما سکتے ہیں۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز خوبصورت کاغذ یا ٹین کی پیکنگ میں بند ہوتی ہے۔ مثلاً بیف، مچھلی اور پورک کے مختلف حصوں کے صاف ستھرے قتلے اور ٹکڑے، — دکانوں میں صفائی اس قدر، کہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ میں نے آتے ہی یہاں کے ایک بڑے جنرل سٹور سے ایک پتلون لی تھی۔ پندرہ روز کے استعمال کے بعد خیال آیا کہ کچھ لمبی ہے۔ واپس لے گیا۔ خیال تھا کہ ذرا چھوٹی والی سے بدل لوں گا۔ لیکن اس کے رکھنے پر وہ بغیر کچھ کہے واپس کر لی گئی اور میری رقم پھر جیب میں واپس آ گئی ——— دودھ، مکھن اور عام روزمرہ اشیاء کی چیزیں بالکل خالص اور نہایت عمدہ ہیں۔ یہاں خوراک میں ملاوٹ کی سخت سزا ہے۔ کسی بھی چیز کا بھاؤ چکانے کا مسئلہ ہی نہیں مقررہ دام ہوتے ہیں۔ مختلف سبزیاں، مثلاً آلو، ٹماٹر، گاجر وغیرہ تھیلیوں میں بند ملتی ہیں۔ کل ہی کچھ گاجریں لے آیا تھا۔ شفاف تھیلے پر کمپنی کا نام، وزن اور قیمت کے علاوہ "GROWN FOR FINE FLAVOUR" بھی درج تھا۔ سبزیاں اور پھل تقریباً ہمارے ہاں جیسے سب ہی دستیاب ہیں اور شکلیں بھی کچھ مختلف نہیں۔ یہاں ریڈنگ

میں شہر کی پلاننگ خوب ہے۔ اونچی عمارتیں چند ہیں۔ مکان بہت خوبصورت اور الگ الگ ہیں ——— "Mobile Shops" آ کر خود روزمرہ استعمال کی اشیاء پہنچا جاتی ہیں۔ دودھ کی بوتلیں، انڈے، ڈبل روٹیاں باہر دروازے کے قریب پڑے رہتے ہیں۔ کسی قسم کی چوری کا خدشہ نہیں۔ اہل خانہ بعد میں لے لیتے ہیں، دودھ کی خالی بوتلیں پھر باہر رکھ دی جاتی ہیں ——— "THANK YOU" کا استعمال ہر ذرا سی بات پر ہے، جو شروع شروع میں بڑا عجیب لگتا ہے۔ بس، کوچ کا کنڈکٹر آپ کو ٹکٹ دے کر ساتھ ہی زور سے تھینک یو بھی کہے گا۔

یہاں لوگ اپنے اپنے مکانوں کے عجیب عجیب نام رکھتے ہیں۔ مکانوں کے باہر مکان نمبر اور کال بیل ہر جگہ ملے گی۔ سڑکوں کے علاوہ گلی کوچوں تک کے نام بورڈوں پر لکھے ہیں ——— یہاں پر WEEK END ہفتے اور اتوار پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہفتے کو عموماً گھر کے تمام لوگ گھر کی اور کار کی صفائی کرتے ہیں۔ دروازوں، کھڑکیوں کے شیشوں کو چمکانے کے علاوہ بیرونی پھاٹک کو پینٹ کرتے نظر آئیں گے۔ کار کو دھونے کے علاوہ چھوٹی موٹی مرمت بھی خود کرتے ہیں۔ کار گیراج ایک ورکشاپ سی معلوم ہوتی ہے۔ اتوار کو عموماً سیر کے لئے باہر یا پھر دوستوں اور احباب سے ملاقات کرتے ہیں۔ بڑے بوڑھے اور کچھ بچے گرجوں میں سروس کو جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ سیر و تفریح کے لئے YACHT اور ٹریلر والے کمرے بھی لوگ رکھتے ہیں۔ کاروں کے پیچھے باندھ کر شہر سے باہر جاتے ہیں۔ سڑکیں عموماً صاف ستھری اور ——— DRAINAGE سسٹم معقول ہے۔ بارش عموماً ہوتی ہے۔ لیکن سڑکیں صاف رہتی ہیں۔ پبلک ٹیلیفون بوتھ جابجا ہیں، جن میں ڈائریکٹری بھی رکھی ہوتی ہے، اور رات کو روشنی بھی ہوتی ہے۔ ٹریفک سگنلز کی تنصیب خوب ہے۔ کاریں عام طور پر تیز ڈرائیو کی جاتی ہیں۔ زیادہ تر برٹش کاریں (چھوٹی) ہی دوڑتی نظر آتی ہیں۔

اب میں طلباء کی دنیا میں واپس آتا ہوں۔ لڑکے اور لڑکی کا امتیاز ختم ہو چکا ہے۔ اکثر طلبا بال بڑھائے ہوئے ملیں گے جبکہ لڑکیاں پتلون یا بہت ہی مختصر MINI سکرٹ میں ملبوس ہوتی ہیں۔ لڑکیاں عموماً سگرٹ نوشی کی عادی ہیں۔ یہاں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں Rags کی سوسائٹیاں زوروں پر ہیں۔ نہایت بوسیدہ اور دقیانوسی کپڑے پہننے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ آرکسٹرا، ڈانس، میوزک کے علاوہ متعدد انجمنیں ہیں جن کے FUNCTION ہوتے رہتے ہیں۔ ANARCHISTS, HUMANISTS, SOCIALISTS کے علاوہ اور بے تحاشا عجیب و غریب سوسائٹیاں ہیں جو لیکچرز وغیرہ کا انتظام کرتی ہیں۔ اعلانات بڑے بڑے پوسٹروں پر نہایت خیال انگیز اور ڈرامائی انداز میں تحریر کئے جاتے ہیں۔ خاص خاص تقریبات میں "BAR EXTENSION" کا اضافی لائسنس دیا جاتا ہے۔ یہاں شراب پر پابندیاں حال ہی میں کچھ سخت کر دی گئی ہیں، جن پر پولیس میں بڑی لے دے ہو رہی ہے۔ ایک آلہ ایجاد کیا گیا ہے جس سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے ڈرائیور کا سانس ماپ کر پینے کی مقدار معلوم کی جاتی ہے۔ اور ایک حد سے بڑھنے پر ایک سال کے لئے لائسنس منسوخ یا ۱۰۰ پونڈ جرمانہ ہوتا ہے۔

طلباء عموماً مذہب سے بیگانہ ہیں۔ چند روز قبل یہاں کے ایک سٹوڈنٹ ہال کے کمرے میں "Can God be Known" کے موضوع پر ایک مبلغ صاحب نے تقریر کی۔ بعد ازاں سوالات کے دوران طلباء نے انہیں اتنا الجھایا کہ وہ بیچارے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ غالباً مبلغ صاحب موجودہ ذہن سے بالکل نابلد تھے۔ بنیادی مسئلے سے ہٹ کر تمام لیکچر میں حضرت عیسیٰؑ کی SONSHIP ثابت کرتے رہے۔ پرسوں ہی BBC پر کیمبرج کے ایک SOCIAL—ANTHROPOLOGIST نے سائنسی ترقی کے بل بوتے پر "WE ARE GODS" کا دعویٰ کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ایک انجانے خوف اور FEELING OF INSECURITY کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان صاحب کو شاید معلوم نہیں کہ یہ احساسات سائنس کی حدود و گرفت سے باہر ہیں۔

یہاں کے طلباء اور نوجوان طبقے کے ذہن کے پس پردہ عصری فلسفیانہ فکر کو بڑا دخل حاصل ہے۔ مابعد الطبیعات مذہب اور روایتی اخلاقی اقدار کے خلاف عام رجحان کے علاوہ برٹرینڈ رسل صاحب اپنے عمرانی افکار میں بالخصوص طلباء کے لئے —— TEMPORARY CHILDLESS MARRIAGE کے علمبردار ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ طلباء کے ہاسٹلوں میں قانونی طور پر ساڑھے دس بجے رات تک گرل فرینڈز کو ENTERTAIN کیا جا سکتا ہے لیکن بالعموم صبح سویرے یونیورسٹی جاتے ہوئے بھی وہ ساتھ ہی ہاسٹل سے نکلتی ہیں۔

لائبریری عموماً بھری ہوئی ملتی ہے۔ طلباء و طالبات مطالعے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ یہاں کا تعلیمی نظام کچھ ایسا ہے کہ طلباء کو ساتھ ساتھ کام کرنا ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کے نئے ڈیپارٹمنٹ اور فیکلٹی آف لیٹرز حال ہی میں ایک بہت بڑے پارک WHITE KNIGHTS PARK میں تعمیر کئے گئے ہیں۔ پورا علاقہ ہرا بھرا اور خوبصورت ہے۔

یہ مختصر سی چیزیں میں نے بغیر ترتیب کے تحریر کر دی ہیں۔ بہرحال یہاں کی روزمرہ کی زندگی کا ایک ہلکا سا خاکہ آپ تک منتقل ہو جائے گا۔ ——— انصار احمدؔ۔

عربی بول چال

عازمینِ حج کے لیے

جو خوش نصیب حضرات امسال حج کے لیے جا رہے ہیں مندرجہ ذیل پتہ سے رسالہ "عربی بول چال" مفت طلب فرمائیں صرف ڈاک خرچ کے سات پیسے ارسال کر دیں۔ اس کتاب میں ان کی ضرورت کے الفاظ، روزمرہ کی گفتگو اور عربی زبان میں ضروری جملے درج ہیں۔

پرنسپل شبلی کالج گڑھی شاہو لاہور

افکار و آراء

خدمتِ دین کی گنجائشیں

مولانا عبد الماجد دریابادی مدیر 'صدق جدید' لکھنؤ۔

"پاکستان کے دینی ماہنامہ 'میثاق' لاہور سے۔ نئی دینی و اجتماعی تنظیم کے سلسلے میں:-

"آخر میں اس امر کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ پیشِ نظر تنظیم ہرگز "الجماعت" کے حکم میں داخل نہ ہوگی۔ الجماعت کا مقام ہماری دانست میں امتِ مسلمہ کو بحیثیت مجموعی حاصل ہے۔ دین کی خدمت ایک نہایت وسیع و عریض کام ہے اور اس کے گوشے بے شمار ہیں۔ ہم ان تمام جماعتوں اور اداروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کسی بھی گوشے میں دین کی خدمت کا کام کر رہی ہیں، اور انشاء اللہ ان کے ساتھ ہمارا رویّہ تعاون و تائید ہی کا ہوگا۔"

بات اصلاً بہت موٹی اور بالکل صاف و واضح ہے لیکن اس زمانے میں بہت بڑی بات ہے۔ دین و امت کی خدمت کے اتنے پہلو ہیں۔ اور خدمت کے لئے گنجائش اتنی ہے کہ اگر نفسانیت کو چھوڑ کر تھوڑے سے بھی عزم و حوصلے کے ساتھ خدمت کا ارادہ ہو تو خلوص اور فہم سلیم سے کام لینے والا ہر فردِ امت اس کے اندر کھپ سکتا ہے۔ اور باہمی مناقشے جو اب تک بڑا سنگ راہ بنا ہوا ہے نجات پا کر ہر گروہ اپنے مذاق و استعداد کے لحاظ سے سچا خادمِ دین بن سکتا ہے۔"

(صدق جدید ۱۰ نومبر ۶۷ء)

جمعیت اتحاد العلماء کے سرکردہ حضرات کا خلافت و ملوکیت کے متعلق فیصلہ

از ماہنامہ 'تعلیم القرآن' راولپنڈی اکتوبر، نومبر ۶۷ء

از قلم، محمد صابر۔ عبد السلام خادم تدریس دار العلوم حسینیہ ڈیبا

"۲۰ ستمبر ۵ بروز بدھ "جمعیت اتحاد العلماء" کے روح رواں مولانا محمد چراغ صاحب (صدر جمعیت) مفتی سیاح الدین صاحب کاکا خیل۔ اور مولانا گلزار احمد صاحب (ناظم جمعیت) اپنے تبلیغی دورے پر حضرو تشریف لائے۔ شیخ القرآن دامت فیوضہم ان دنوں ڈیرہ میں نظر بند تھے یہ حضرات انہیں ملنے کے لئے ڈیرہ بھی تشریف لائے۔ اثنائے کلام ان حضرات سے "خلافت و ملوکیت" اور داڑھی کی شرعی مقدار کے متعلق استفسار کیا گیا جملہ حضرات نے جس فرض شناسی اور حق گوئی

کا ثبوت دیتے ہوئے جواب فرمایا وہ اپنی مثال آپ ہے اسے ہدیۂ قارئین کیا جاتا ہے تاکہ وہ خود فیصلہ فرمالیں کہ مودودی صاحب کے ان پیش کردہ نظریات کے صرف علمائے کرام ہی مخالف ہیں یا ہر اہلِ بصیرت ....

" خلاصہ کلام ہم نے ان سے ان کی رائے طلب کی تو صدر جمعیت مولانا محمد چراغ صاحب نے فرمایا میں "خلافت و ملوکیت" کے نظریات سے بیزار ہوں اور میں نے برأت کا خط بھی مولانا مودودی صاحب کو لکھ دیا تھا۔

مفتی سیاح الدین کاکاخیل نے فرمایا کہ ایک میٹنگ میں مجھے "خلافت و ملوکیت" کے دفاع کے لئے کہا گیا تو میں نے کہا کہ دفاع تو در کنار میں تو خود اس سے بیزار ہوں۔

(یہ الفاظ بعینہٖ ان دونوں بزرگوں کے ہیں جو ہم نے اس وقت ہی قلمبند کر لیے تھے)"

ہم سے طلب فرمائیے،

تصانیف مولانا فراہی

تفاسیر

مقدمہ تفسیر نظام القرآن	قیمت ۹۰ء۰ روپے
تفسیر بسم اللہ و سورۃ فاتحہ	۴۵ء۰ 〃
〃 سورہ قیامہ	۶۰ء۰ 〃
〃 〃 والشمس	۵۰ء۰ 〃
〃 〃 فیل	۲۰ء۱ 〃
〃 〃 ذاریات	۴۰ء۱ 〃
〃 〃 مرسلات	۶۰ء۰ 〃
〃 〃 والتین	۷۰ء۰ 〃
〃 〃 کوثر	۱۰ء۱ 〃
〃 〃 لہب	۷۰ء۰ 〃
〃 〃 تحریم	۷۵ء۰ 〃
〃 〃 عبس	۷۵ء۰ 〃
〃 〃 والعصر	۶۰ء۰ 〃
〃 〃 کافرون	۴۵ء۰ 〃
〃 〃 اخلاص	۴۵ء۰ 〃
اقسام القرآن	۳۰ء۱ 〃
ذبیح کون ہے ؟	۷۰ء۱ 〃

لغت و ادب

اسباق النحو

حصہ اول : ۴۰ء۱ روپے

〃 دوم : ۰۰ء۱ 〃

★

امثال آصف الحکیم

قیمت : ۳۷ء۱ 〃

★

جمہرۃ البلاغہ

قیمت : ۵۰ء۱ 〃

★

مفردات القرآن

قیمت : ۴۰ء۱ 〃

★

دیوان (عربی)

قیمت : ۵۰ء۱ 〃

★

نوائے پہلوی (دیوان فارسی)

قیمت : ۰۰ء۴ 〃

دار الاشاعت الاسلامیہ - کرشن نگر - لاہور ۱

تقریظ و تنقید

ادارہ

اسلامی مذاہب

(مولفہ شیخ محمد ابو زہرہ پروفیسر لا کالج جامعۃ القاہرہ مصر

ترجمہ و تحشیہ از پروفیسر غلام احمد حریری ایم۔ اے۔ ایم او ایل فاضل السنۂ شرقیہ، صدر شعبۂ اسلامیات، اسلامیہ کالج لائلپور سائز ۲۰×۲۶ ۴۲۰ صفحات ناشر ملک برادرس، اردو بازار، لائلپور۔ کاغذ سفید، کتابت طباعت بہتر، مجلد مع ڈسٹ کور،

قیمت .... نو روپے

اگرچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں مسلمانوں کو بروقت متنبہ فرما دیا تھا کہ " وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ‎o مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ط اور مت ہو جاؤ شرک کرنے والوں میں سے (یعنی) ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا اور بہت سے گروہ ہو گئے۔ (۳۰ - ۳۲)، لیکن عبداللہ ابن سبا یہودی منافق کی ذہانت، دور بینی اور حکمت عملی قابل داد ہے کہ اس نے کمال چابکدستی سے مسلمانوں کے قلوب میں تفرقہ کا بیج بو کر وحدت ملی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا چنانچہ مولف کتاب لکھتا ہے:-

" اختلاف کا سب سے بڑا سبب اعداء دین کا وجود تھا۔ یہ لوگ اسلام کے زیر سایہ زندگی بسر کرتے تھے مگر اہل اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے تھے۔ انہوں نے دینی غیرت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا بظاہر دین اسلام کے دعوٰی دار تھے مگر باطن کفر کی پشت پناہی کرتے تھے۔ ان کی فتنہ سامانیوں کا آغاز حضرت عثمانؓ کی مذمت اور حضرت علیؓ کی قصیدہ خوانی سے ہوا۔ بلاد و امصار میں بغاوت کی روح پھونکتے اور وُلاۃ و حُکّام کے کرتوتوں کو اپنی دعوت کا ذریعہ بناتے تھے۔ ان کا سرغنہ عبداللہ ابن سبا تھا۔ مورخ طبری اس کے متعلق لکھتے ہیں:

" عبداللہ ابن سبا یمن کے شہر صنعا کا رہنے والا ایک یہودی تھا۔ اس کی ماں ایک سیاہ فام کنیز تھی۔ وہ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں اسلام لایا اور مختلف بلاد و امصار میں گھوم پھر کر مسلمانوں کو گمراہ کرتا رہا۔ بلادِ حجاز سے آغاز کر کے بصرہ اور شام پہنچا مگر اس کی آرزو برنہ آئی۔ اہل شام نے جب اُسے نکال دیا تو مصر پہنچا (لوگوں سے) کہنے لگا کہ یہ بات بڑی تعجب خیز ہے کہ وہ، مسلمان حضرت عیسیٰ کے آسمان سے نازل

ہونے پر ایمان رکھتے ہیں مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رجعت کو تسلیم نہیں کرتے، حالانکہ قرآن آپ کے بارے میں کہتا ہے: "اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ ۝ (۲۸ : ۸۵)

(اسلئے) محمد صلی اللہ علیہ وسلم لوٹ کر آنے کا حضرت عیسیٰ سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔

(۲) پھر کہتا دنیا میں ہزاروں انبیاء آئے۔ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے۔ (لہٰذا) حضرت علیؓ حضرت محمد صلی اللہ کے وصی تھے۔

(۳) پھر کہتا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء تھے اور حضرت علیؓ خاتم الاوصیاء تھے۔

(۴) وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ حضرت عثمانؓ نے حق خلافت غصب کر رکھا ہے۔ اس کے اصلی حقدار حضرت علیؓ ہیں۔ ایسے حالات میں تم لوگوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑے ہو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے ولاۃ و حکام کے نقائص و معائب بیان کیجئے اور اس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کر کے لوگوں کی ہمدردی حاصل کیجئے۔ چنانچہ اس نے ہر طرف اپنے داعی بھیجے جنہوں نے لوگوں کو ورغلانا شروع کیا، جس سے شہروں میں فتنہ و فساد کا دور دورہ ہو گیا۔ یہ داعی بذریعۂ تحریر اپنے افکار و نظریات کی اشاعت کرتے تھے اور اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مصداق قرار دیتے تھے۔ وہ ولاۃ و حکام کے معائب سے لبریز خطوط مختلف بلاد و امصار میں بھیجتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے معائب کی بڑی تشہیر ہوئی۔ اس سے ان کا مقصد ہرگز وہ نہ تھا جس کا وہ اظہار کرتے تھے اور جو باتیں وہ برملا کہتے تھے، ان کے دلیں ہرگز نہ تھیں"

شیخ المورخین طبری کا یہ بیان اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ عبداللہ ابن سبا اور اس کے ساتھیوں نے اس امت میں فساد پھیلانا شروع کیا۔ حضرت عثمانؓ کے بعض ولاۃ و حکام کی شکایات کو نقض بیعت (عثمانؓ) کے لئے حیلہ بنا کر اور امت میں افکار باطلہ کی تشہیر کر کے اس کے شیرازے کو منتشر کر دیا۔ علوم

عربی زبان میں فرقوں کی جو تاریخیں لکھی گئیں، ان میں امام عبدالکریم الشہرستانی کی کتاب الملل والنحل اور علامہ ابن حزم ظاہری کی کتاب الملل والنحل اور شیخ عبدالقاہر البغدادی کی الفرق بین الفرق بہت مشہور ہیں۔ عصر حاضر میں شیخ ابو محمد زہرہ نے اس موضوع پر "المذاہب الاسلامیہ" کے نام سے ایک مختصر کتاب لکھی ہے جسے پروفیسر حریری نے اردو کا لباس پہنایا ہے اور اس میں شک نہیں کہ بہت اچھا ترجمہ کیا ہے۔ پروفیسر صاحب نے پہلے عرض مترجم کے عنوان سے اس کتاب کا تعارف اور خلاصہ پیش کیا ہے پھر اصل کتاب کا ترجمہ شروع ہوتا ہے۔ "عرض مترجم" میں پروفیسر صاحب لکھتے ہیں "کہ آپ (ابو محمد زہرہ) نہ صرف ایک بلند پایہ فقیہہ اور زبردست عالم دین ہیں بلکہ اپنے اندر بے پناہ دینی غیرت و حمیت بھی رکھتے ہیں" صہ ۲

لیکن جب ہم نے اس زبردست عالم دین اور بلند پایہ فقیہہ اور صاحب حرارت ایمانی و غیرت دینی کی مذکورہ بالا تالیف کا ایمان سوز اور غیرت کش ترجمہ پڑھا تو ہمیں بہت تعجب ہوا کہ فاضل مترجم نے مولف کتاب کو ان گراں بہا القاب سے کیسے نوازا ہے۔ ترجمے سے تین اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

(الف) "مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے آپ (حضرت علیؓ) کو سازگار فضا پیدا کرنے کا موقع نہ دیا بلکہ آپ کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے۔ مسلمانوں کو نقض بیعت پر آمادہ کیا اور آپ کی بیعت کرنے والوں کو منتشر کیا" صہ ۱۲۱

(ب) "ان حالات کے پیش نظر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اسلامی مصلحت کے آگے جھک جانا چاہیئے تھا اور مسلمانوں کی اکثریت کا ساتھ دینا چاہیئے تھا" صہ ۱۲۱

(ج) "مگر بات یہ تھی کہ ہر طرف حرص و آز کی کارفرمائی تھی۔ عصبیت ہر طرف عام تھی۔ حقد و عناد کا دور دورہ تھا۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ تعالیٰ۔" صہ ۱۲۲

پہلے اقتباس کے ضمن میں فاضل مترجم نے متعصب مولف پر ان الفاظ میں گرفت کر کے اپنی حرارت ایمانی اور غیرت دینی کا ثبوت مہیا کیا ہے۔ (وللہ درہ من قائل)

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ صحابی رسولؐ، کاتب وحی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی عزیز تھے۔ مصنف کے یہ الفاظ، آپ کی شان میں سوء ادب اور صحابہؓ کی شان میں گستاخی کا بدترین نمونہ ہیں۔ ابو زہرہ کی کتابوں کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے ان کے اس رجحان کا پتہ چلتا ہے کہ وہ تفضیل علیؓ کے نظریہ کی جانب مائل ہیں۔ انہوں نے اپنی تصانیف میں کہیں بھی حضرت معاویہؓ اور ان کے والد حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ سے انصاف نہیں کیا اور نہ ان کی خدمات کو سراہا بلکہ ہمیشہ ایک ہی آنکھ سے دیکھتے رہے پس ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ ان کی اس لغزش عظیم کو معاف فرما دے کیونکہ یہ گناہ کبیرہ ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "میرے صحابہؓ پر سب و شتم ایسا گناہ ہے۔ جسے معاف نہیں کیا جائیگا"

(غلام احمد حریری مترجم)

ہم فاضل مترجم کو اس اعلان حق پر صد دل سے مبارکباد دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ انہیں ہمیشہ اسی طرح اعلاء کلمۃ الحق کی توفیق بخشتا رہے۔

فاضل مترجم نے "یک چشم" مولف کی زلۃ عظیمہ کی نشاندہی تو کر دی مگر اس کے داخل کردہ زہر کا تریاق مہیا نہیں کیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کی رائے میں حواشی اس کے ناکافی ہوں گے یا پھر تفصیلی بحث کی انہیں فرصت نہ ہوگی۔

مؤلف کتاب (ابو محمد زہرہ) نے یہ کہکر کہ "ہر طرف حرص و آز کی کارفرمائی تھی، عصبیت ہر طرف عام تھی اور حقد و عناد کا دور دورہ تھا" تمام اُن صحابہؓ پر بلا استثناء زبان طعن دراز کی ہے جو شہادت عثمانؓ کے وقت زندہ تھے اور ان میں سے حضرات طلحؓہ اور سعد ابن ابی وقاصؓ تو اُن صحابہ میں سے ہیں جن کے جنتی ہونے کی بشارت خود حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے دی تھی۔ اس فقرے کا صاف مطلب یہ ہے کہ تمام صحابہؓ حرص و آز میں مبتلا تھے اور ان کے سینوں میں حقد و عناد بھرا ہوا تھا۔ ہم اس کذب صریح پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتے، کیونکہ یہ دعوٰی بدیہہ البطلان ہے۔ صرف اس بات پر اکتفا کرتے ہیں کہ یہ قول قائل کی مسموم ذہنیت کا زندہ مرقع اور بُغضِ صحابہؓ کی جیتی جاگتی تصویر ہے اگر اسی کا نام حرارتِ ایمانی ہے تو اللہ ہر مسلمان کو اس حرارت سے جو نارِ جہنم کی حرارت سے کم نہیں ہے، محفوظ رکھے۔ ؎

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

کیا اچھا ہوتا اگر فاضل مترجم اس کتاب کے بجائے، شہرستانی کی کتاب کا ترجمہ کرتے یا پھر مؤلفِ کتاب کی زہر چکانی کا قرار واقعی مداوا کر دیتے۔ جب عامۃ المسلمین، جن کی غالب اکثریت تاریخ اسلام سے نابلد ہے، یہ فقرہ پڑھینگے کہ شہادت عثمانؓ کے بعد "ہر طرف حقد و عناد کا دور دورہ تھا"، تو لا محالہ وہ تمام صحابہؓ سے بدظن ہو جائیں گے اور اگر یہ مان لیا جائے کہ ان کی سیرت اس درجہ پست تھی تو پھر جو دین اُن سے منقول ہے اس کی، اُن کے دلوں میں کیا وقعت باقی رہ جائے گی؟ فاضل مترجم سے زیادہ، اس حقیقت سے کون آگاہ ہو سکتا ہے کہ صحابہؓ کی سیرت کو جس قدر زیادہ داغدار کیا جائیگا، دین اسلام اُسی قدر زیادہ ناقابلِ اعتماد قرار پائیگا۔

کتاب کے کل ۲۱۶ صفحات میں سے ۱۲۲ صفحات اُمت کے ان فرقوں سے بحث کرتے ہیں جنہیں مصنف نے "سیاسی مذاہب" کا نام دیا ہے۔ اور بقیہ کتاب "اعتقادی مذاہب" سے بحث کرتی ہے ——— اس ضمن میں فاضل مصنف نے جبریہ، قدریہ، مرجئہ، معتزلہ، اور ان کا پیدا کردہ مسئلہ خلق قرآن ——— پھر اشاعرہ، ماتریدیہ اور سلفیہ کے مسلک کے مابہ الامتیاز امور کو بیان کیا ہے اور ایک عام قاری کے لئے واقعۃً خاصا قابلِ قدر مواد مہیا کر دیا ہے ——— "جدید فرقوں" کے عنوان سے وہابی تحریک اور بہائی و قادیانی مذاہب پر کلام کیا گیا ہے ——— بحیثیت مجموعی کتاب مفید ہے اور اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ ——— (ا۔ د۔ ا۔ ح)

بقیہ تذکرہ و تبصرہ صفحہ سے آگے

الی اللہ کے فریضے کو ادا کرے گی اور "کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ" کی صحیح معنی میں مصداق ہوگی اور تمام بنی نوع انسان پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے جانب سے اتمام حجت کرے گی۔ "لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ" اس کے برعکس اگر ترتیب یہ ہے کہ بلند بانگ دعاوی سے کام شروع کیا جائے اور پہلے ہی قدم پر عالمی انقلاب کا نعرہ لگایا جائے اور نجات اخروی کا بس تبرکاً تذکرہ کر کے قیام حکومت الٰہیہ اور نفاذ نظام اسلامی کو اولین ہدف بنا کر جد و جہد شروع کی جائے تو بسا اوقات چند ہی قدم چل کر انسان ہار جاتا ہے اور خود اپنی طے کردہ راہ کی کسی ادنیٰ سی چیز کو اپنا مجبوری نصب العین قرار دے کر بس اسی کا ہو رہتا ہے۔ فَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذَالِكَ! ——— اقول قولی ھٰذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات۔ وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

"تدبر قرآن"، جلد اول اپنے بہت سے قدر دانوں کے ہاتھوں میں پہنچ بھی چکی ہے۔ اور باقی حضرات تک بھی عنقریب پہنچ جائے گی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمیں اپنے کام، یعنی کتابت، طباعت، اور جلد بندی پر ہر طرف سے مبارکباد ملی۔ اور اس اعتبار سے ہماری محنت سپھل ہوئی۔ باقی اس محنت کا درحقیقت سپھل ہونا تو یہ ہے کہ یہ اللہ تعالے کی بارگاہ میں شرف قبولیت پائے ——— اور اس کی ہمیں اللہ تعالے کے فضل و کرم سے پوری امید ہے۔

ہمارے اوپر اس کتاب کی طباعت و اشاعت کے سلسلے میں بعض دوستوں کے شکریئے کا قرض بھی ہے۔ برادرم خالد مسعود صاحب نے جس محنت اور تندہی کے ساتھ اس کی کاپیاں یک بار، دوبار بلکہ سہ بار پڑھیں وہ کچھ ان ہی کا حصہ ہے۔ ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں، برادرم محمود احمد لودھی نے ایک مشکل وقت میں رقم مہیا کر کے تعاون کیا جس کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں، برادرم محی الدین سلفی اور منیجر میثاق، علیم الدین صاحب نے مختلف انتظامی امور میں بھاگ دوڑ کر کے امداد کی۔ ہم ان کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں ———

باقی ان سب حضرات کی محنت کا اصل اجر اللہ ہی دے گا۔ واللہ عندہٗ حسن الثواب ٥

ہندوستان سے جو حضرات تدبر قرآن جلد اوّل حاصل کرنا چاہیں وہ مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک جگہ بتیس روپے (۳۲/=) ارسال فرما کر ہمیں مطلع فرمائیں۔

۱۔ دفتر ماہنامہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ۔

۲۔ دائرہ حمیدیہ، سرائے میر، اعظم گڈھ

ان دونوں مقامات کے ذمہ دار حضرات سے ہماری استدعا ہے کہ وہ اس کی اطلاع ہمیں فوراً بذریعہ کارڈ کر دیں ـــ یہاں سے کتاب بذریعہ رجسٹرڈ (A-D) بک پوسٹ براہ راست خریدار کے پتہ پر ارسال ہوگی لیکن یہ ترسیل ان دو مقامات میں سے کسی ایک کی جانب سے اطلاع آجانے کے بعد ہوگی۔

جماعت اسلامی

- کن مقاصد کے تحت قائم ہوئی تھی؟
- آزادی سے قبل اس کے نظریات کیا تھے؟
- قیامِ پاکستان کے بعد اس نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا؟ اور
- اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

جماعت کے ماضی و حال کا ایک تاریخی تجزیہ جماعت کے سابق کارکن کے قلم سے

تحریک جماعت اسلامی

ایک تحقیقی مطالعہ

تالیف

ڈاکٹر اسرار احمد، ایم بی بی ایس، ایم اے

سابق ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان و امیر جماعت اسلامی منٹگمری

• ضخامت ۲۳۰ صفحات • سائز بڑا • طباعت آفسٹ • مجلد مع گرد پوش

• قیمت - ۴ روپے علاوہ محصول ڈاک

دار الاشاعت الاسلامیہ

لاہور میں
مولانا امین احسن اصلاحی

کا ہفتہ وار درس قرآن و حدیث

✱ ہر اتوار کو ✱ دو بجے بعد دوپہر تا ساڑھے تین بجے شام ✱ ڈاکٹر اسرار احمد کے مکان واقعہ امرت روڈ، کرشن نگر میں ہوتا ہے۔ ✱ قرآن حکیم میں انتیسواں پارہ مسلسل اور ✱ حدیث میں ”ریاض الصالحین“ کے منتخب ابواب زیر درس ہیں۔

شرکت کی عام دعوت ہے!

ہم سے طلب فرمائیے
تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

★ دعوت دین اور اس کا طریق کار
صفحات: ۳۱۲، قیمت: ۳٫۷۵ روپے

★ تزکیہ نفس
صفحات: ۳۴۴، قیمت: ۶٫۰۰ روپے

★ اسلامی قانون کی تدوین
صفحات: ۱۶۰، قیمت: ۳ روپے
سستا ایڈیشن: ۲ روپے

★ عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ
صفحات: ۱۲۸، قیمت: ۲٫۲۵ روپے

اس کے علاوہ

حضرت عائشہ صدیقہ رض	سلام اللہ صدیقی جونپوری	۱۰٫۰۰ روپیہ
حضرت معاویہ بن ابی سفیان رض	” ” ”	۱٫۳۰ ”
تاجدار مدینہ کی شہزادیاں	” ” ”	۱٫۱۵ ”
حضرت عمرو بن العاص	” ” ”	۲٫۹۰ ”
وفات سرور کائنات ص	محمد سراج الحق مچھلی شہری	۱٫۳۰ ”
اہلبیت اور اہلسنت	” ” ”	۱٫۱۵ ”
اسلامی حکومت کے نقش و نگار	مولانا ظفیر الدین مفتاحی	۲٫۰۰ ”
تحفۂ کربلا	محمد احمد الہ آبادی	۰٫۶۰ ”
مولانا مودودی اور سیدنا عثمان غنی رض	محمد سراج الحق مچھلی شہری	۲٫۳۰ ”

دار الاشاعت الاسلامیہ

امرت روڈ، کرشن نگر، لاہور ـ، فون نمبر 69522